MOASSESAH AL IMAM KHOMEINI TRUST (REGD)
کتابخانہ امام خمینی

دعوتِ اسلامی

اور

اُس کے مُطالبات

از

مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی

مولانا امین احسن صاحب اِصلاحی

میاں طفیل محمد صاحب

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکٹ۔ لاہور

MOASSESAH AL IMAM KHOMEINI TRUST (REGD)

MOASSESAH AL IMAM KHOMEINI TRUST (REGD)
کتابخانہ امام خمینی

دعوتِ اسلامی

اور

اُس کے مطالبات

از

مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

میاں طفیل محمد صاحب

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکٹ۔ لاہور

طابع : اخلاق حسین ڈائریکٹر

ناشر : اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
شاہ عالم مارکیٹ ، لاہور

مطبع : ایورگرین پریس لاہور

قیمت : اعلیٰ ایڈیشن = ۳٫۷۵ روپے
پلاسٹک کور = ۱٫۰۰ } ۴٫۷۵ سستا ایڈیشن ۲٫۶۰ روپے

بار اول	۱۹۴۶ء	۲۰۰۰
بار دوم	۱۹۴۷ء	۲۰۰۰
بار سوم	۱۹۵۰ء	۱۰۰۰
بار چہارم	۱۹۵۳ء	۱۱۰۰
بار پنجم	۱۹۵۶ء	۱۱۰۰
بار ششم	اپریل ۱۹۶۴ء	۱۰۰۰
بار ہفتم	جون ۱۹۶۷ء	۲۰۰۰

MOASSESAH AL IMAN KHOMEINI TRUST (REGD)
کتابخانہ امام خمینی

فہرست مضامین

عرضِ ناشر ۵

دعوت اسلامی اور اس کا طریقِ کار ۷

(مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

ہماری دعوت کیا ہے؟ ۱۲

دعوت اسلامی کے تین نکات ۱۳

بندگیٔ رب کا حقیقی مفہوم ۱۴

منافقت کی حقیقت ۱۶

تناقض کی حقیقت ۱۸

امامت میں تغیر کی ضرورت ۲۱

امامت میں انقلاب کیسے ہوتا ہے؟ ۲۳

مخالفت اور اس کے اسباب ۲۴

ہمارا طریقِ کار ۳۳

علماء اور مشائخ کی آڑ ۴۴

زہد کا طعنہ ۴۵

رفقاء سے خطاب ۵۰

دعوتِ اسلامی اور اُسکی کامیابی کے اصول ۶۱

(از مولانا امین احسن صاحب اصلاحی)

اسلام کے اساسی معتقدات اور ان کا مفہوم ۶۵

ایمان باللہ ۶۶

ایمان بالرسالت ۶۸

ایمان بالکتاب ۷۰

حق و باطل کے معرکہ میں ہمارا فرض ۷۳

مسلمانوں کے اقسام ۷۵

تحریکِ اسلامی کا قیام اور اسکی غرض ۷۸

کامیابی کا معیار ۸۰

نصرتِ حق کب آتی ہے؟ ۸۲

دعوتِ اسلامی اور اس پر لبیک کہنے والوں کے فرائض ۸۷

(میاں طفیل محمد صاحب)

گزری ہوئی زندگی کا محاسبہ ۹۰

خدا کے دین کا صحیح تصوّر ۹۴

نماز کا عملی مقصود ۱۰۵

نماز کا سب سے پہلا کلمہ ۱۰۵

تکبیر تحریمہ ۱۰۶

ثنا ۱۰۷

تعوّذ ۱۱۰

سورۂ فاتحہ ۱۱۰

سورۂ اخلاص ۱۲۲

رکوع، قومہ اور سجدہ ۱۲۳

التحیات ۱۲۵

درود شریف پڑھنے کا تقاضہ ۱۲۹

رات کی تنہائیوں میں جو اقرارِ عبودیّت کرتے ہیں ۱۳۱

دعاء قنوت ۱۳۱

آخری دعا اور سلام ۱۴۴

اقامتِ صلوٰۃ کی حقیقت ۱۴۵

اذان کا مقصد اور اسکی حقیقت ۱۵۰

دین پوری زندگی پر حاوی ہے ۱۵۳

آج دنیا میں اسلامی نظام کیوں قائم نہیں ہے؟ ۱۵۸

دعوتِ اسلامی کا طریق ۱۶۶

پہلا قدم ۱۶۷

عبادت کی حقیقت ۱۷۲

رُوحانیّت کیا ہے؟ ۱۷۷

اسلام میں عزّت و سربلندی کا مفہوم ۱۸۲

دینِ اسلام صرف مسلمانوں کا دین نہیں ۱۸۷

دینِ اسلام کو صرف مان لینا کافی نہیں ہے ۱۹۱

غیر مسلموں کے لیے اسلام کا پیغام ۱۹۸

دعوتِ اسلامی اور اس میں خواتین کا حصّہ ۲۱۵

(مولانا امین احسن اصلاحی)

عرضِ ناشر

اسلام کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے اور اس کے مخاطب کون ہیں؟ ماننے والوں سے اس کے مطالبات کیا ہیں؟ اس کو برپا کرنے کے کیا شرائط ہیں؟ اس کی راہ میں کامیابی اور ناکامی کا مفہوم کیا ہے؟ اس دعوت کو برپا کرنے کے لیے خواتین کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ ان اہم موضوعات پر اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں یہ ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ غیرتِ دینی اور ایمانی حرارت کو انگیخت کرنے اور جذباتِ اسلامی کو بیدار کرنے کے لیے یہ کتاب اپنا جواب نہیں رکھتی ۔ ہمت و عزیمت اور علم و حکمت کا ایک اتھاہ خزانہ ہے جو اس میں سمو دیا گیا ہے۔ تربیت و اصلاح کے لیے ایک ایسا مجموعہ ہے جس سے کبھی بے نیاز نہیں ہوا جا سکتا۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں پیش کیا گیا تھا اس لیے جا بجا اس میں قبل تقسیم کے حالات و واقعات کی طرف اشارے ہیں اور ان پر تبصرہ ہے۔ لیکن اس کا بیشتر حصہ ایسے مضامین پر مشتمل ہے جو زمان و مکان کی قید سے بالا ہیں اور جن کی تازگی ہمیشہ برقرار رہے گی۔ اس کتاب کی اس علمی اور تاریخی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر ہم اس کا جدید اڈیشن آفسٹ کی حسین طباعت پر نہایت

آب و تاب کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ ہماری اس تازہ پیش کش کا اس ہی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا جائے گا جیسا کہ ہماری دوسری مطبوعات کے لیے کیا گیا ہے۔

نیاز مند:

اخلاق حسین

جنرل مینجر:

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکٹ۔ لاہور

لاہور۔

۱۴؍ اپریل ۱۹۶۴ء

دعوتِ اسلامی

اور

اُس کا طریقِ کار

از

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

"مَیں نے دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے ہمیشہ قرآن اور سنّت ہی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے مَیں کبھی یہ معلوم کرنے کے لیے کہ خدا کا دین مجھ سے اور ہر مومن سے کیا چاہتا ہے یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ فلاں بزرگ کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں بلکہ صرف یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ قرآن کیا کہتا ہے اور رسولؐ نے کیا کیا۔"

"ہم دراصل ایک ایسا گروہ تیار کرنا چاہتے ہیں جو ایک طرف زہد و تقویٰ میں اصطلاحی زاہدوں اور متقیوں سے بڑھ کر ہو اور دوسری طرف دنیا کے انتظام کو چلانے کی قابلیت و صلاحیت بھی عام دنیاداروں سے زیادہ اور بہتر رکھتا ہو۔ صالحین کی ایسی جماعت منظم کی جائے جو خدا ترس بھی ہو، راست باز اور دیانتدار بھی ہو، خدا کے پسندیدہ اخلاق و اوصاف سے آراستہ بھی ہو اور اس کے ساتھ دنیا کے معاملات کو دنیاداروں سے زیادہ اچھی طرح سمجھ سکے۔"

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

الحمد للہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نستغفرہٗ و نؤمن بہٖ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضلّ لہٗ و من یضللہ فلا ھادِیَ لہ ط و نشھد ان لا الٰہ الّا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ و نشھد انّ محمّداً عبدہٗ و رسولہٗ ط

سب سے پہلے مَیں اس امر پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے ہمیں ایک نہایت خشک دعوت اور نہایت بے مزہ طریقِ کار کو بالآخر لوگوں کے لیے دلچسپ و خوش ذائقہ بنانے میں توقع سے زیادہ کامیابی عطا کی۔ ہم جس دعوت کو لے کر اُٹھے تھے اس سے زیادہ کاسد جنس آج دنیا کی دعوتوں کے بازار میں اور کوئی نہ تھی۔ اور اس کے لیے جو طریقِ کار ہم نے اختیار کیا اس کے اندر ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی نہ تھی جو آج کل دنیا کی دعوتوں کے پھیلانے میں اور خلق کو اپنی طرف متوجّہ کرنے میں استعمال کی جاتی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں اور یہ دیکھ کر ہمارا دل شکر و سپاس کے جذبے سے لبریز ہو جاتا ہے کہ بندگانِ خدا روز بروز کثرت کے ساتھ ہماری

اس دعوت کی طرف کھنچ رہے ہیں اور ہماری بے لطف نشستوں میں شرکت کے لیے دُور دُور سے بغیر کسی طلب کے آتے ہیں۔ یہ کشش بہر حال حق کی کشش ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس حق کے سوا اور چیز کھینچنے والی سرے سے ہے ہی نہیں۔

ہماری ان نشستوں کا مقصد کوئی مظاہرہ کرنا اور ہنگامہ برپا کر کے لوگوں کو اپنی طرف متوجّہ کرنا نہیں ہے۔ ہماری غرض ان سے صرف یہ ہے کہ ..... ہم ایک دُوسرے سے مُتعارف اور مربُوط ہوں۔ ہمارے درمیان اجنبیّت اور ناآشنائی باقی نہ رہے۔ ہم ایک دُوسرے سے قریب ہوں اور باہمی مشورے سے تعاون کی صُورتیں نکالیں اور اپنے کام کو آگے بڑھانے اور مشکلاتِ راہ اور پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کی تدبیریں سوچیں۔ اس کے علاوہ ہمارے پیشِ نظر ان نشستوں سے یہ فائدہ بھی ہے کہ ہمیں اپنے کام کا جائزہ لینے اور اس کی کمزوریوں کو سمجھنے اور اُنہیں دُور کرنے کا وقتاً فوقتاً موقع ملتا رہتا ہے۔ نیز جو لوگ ہم سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ یا ہمارے خیالات سے متاثر ہیں، یا ہمارے کام کے متعلق کچھ شکوک و شبہات رکھتے ہیں ان کو بھی یہ موقع مِل جاتا ہے کہ بالمشافہ ہماری دعوت اور ہمارے کام کو سمجھیں۔ اور اگر ان کا دل گواہی دے کہ ہم واقعی حق پر ہیں تو ہمارے ساتھ شریک ہو جائیں۔ بہت سی غلط فہمیاں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ صرف دُوری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور بڑھتی رہتی ہیں۔ محض قرب اور مشاہدہ اور معائنہ اور شخصی تعلّق

ہی ایسی غلط فہمیوں کو رفع کر دینے کے لیے Personal Contact. کافی ہوتا ہے ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور اُن حضرات کے بھی شکر گذار ہیں جو اپنا وقت اور اپنا مال صرف کر کے ہمارے ان نشستوں میں محض ہماری بات سمجھنے کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ ہم ان کی اس جستجوئے حق کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ جہاں ان کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہے وہاں وہ محض اس وجہ سے آتے ہیں کہ اللہ کے کچھ بندے جو اللہ کا نام لے کر ایک کام کر رہے ہیں ان کے متعلق تحقیق کریں کہ واقعی ان کا کام کس حد تک اللہ کا ہے اور اللہ کے لیے ہے۔ یہ مخلصانہ حق جوئی اگر ذہن و دماغ کی صفائی کے ساتھ بھی ہو تو اللہ ان کی سعی و جستجو کو ضائع نہ ہونے دے گا اور ضرور انہیں حق کے نشاناتِ راہ دکھائے گا۔

چونکہ یہاں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہماری دعوت اور ہمارا مقصد کیا ہے، اور کس طریقے سے ہم اس کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اس لیے سب سے پہلے میں انہی دو اُمور پر کچھ عرض کرونگا۔

ہماری دعوت کیا ہے؟

ہماری دعوت کے متعلق عام طور پر جو بات کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی دعوت دیتے ہیں۔ حکومتِ الٰہیہ کا لفظ کچھ تو خود غلط فہمی پیدا کرتا ہے اور کچھ اسے غلط فہمی پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں اور انہیں ایسا سمجھایا بھی جاتا ہے کہ حکومتِ الٰہیہ سے مراد محض ایک سیاسی نظام ہے اور ہماری غرض اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ موجودہ نظام کی جگہ وہ مخصوص سیاسی نظام قائم ہو۔ پھر چونکہ اس سیاسی نظام کے چلانے والے لامحالہ وہی مسلمان ہوں گے جو اس کے قیام کی تحریک میں حصّہ لے رہے ہوں اس لیے خود بخود اس تصوّر میں سے یہ معنی نکل آتے ہیں یا ہوشیاری کے ساتھ نکال لیے جاتے ہیں کہ ہم محض حکومت چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ایک دیندارانہ وعظ شروع ہوتا ہے اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے پیشِ نظر محض دنیا ہے۔ حالانکہ مسلمان کے پیشِ نظر دین اور آخرت ہونی چاہیے اور یہ کہ حکومت طلب کرنے کی چیز نہیں ہے بلکہ ایک انعام ہے جو دیندارانہ زندگی کے صلے میں اللہ کی طرف سے مِل جاتا ہے۔ یہ باتیں کہیں تو نافہمی کے ساتھ کی جاتی ہیں اور کہیں نہایت ہوشمندی کے ساتھ اس غرض کے لیے کہ اگر ہمیں نہیں تو کم سے کم خلقِ خدا کے ایک بڑے حصّے کو بدگمانیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا کیا جائے، حالانکہ اگر کوئی شخص ہمارے لٹریچر کو کھلے دل کے ساتھ پڑھے

تو اس پر بآسانی یہ بات کھل سکتی ہے کہ ہمارے پیشِ نظر صرف ایک سیاسی نظام کا قیام نہیں ہے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ پوری انسانی زندگی ـــــ انفرادی اور اجتماعی ـــــ میں وہ ہمہ گیر انقلاب رونما ہو جو اسلام رونما کرنا چاہتا ہے، جس کے لیے اللہ نے اپنے انبیاء کو مبعوث کیا تھا اور جس کی دعوت دینے اور جدوجہد کرنے کے لیے ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کی امامت و رہنمائی میں امت مسلمہ کے نام سے ایک گروہ بنتا رہا ہے۔

دعوتِ اسلامی کے تین نکات

اگر ہم اپنی اس دعوت کو مختصر طور پر صاف اور سیدھے الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو یہ تین نکات Points پر مشتمل ہوگی:

(۱) یہ کہ ہم بندگانِ خدا کو بالعموم اور جو پہلے سے مسلمان ہیں ان کو بالخصوص اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں۔

(۲) یہ کہ جو شخص بھی اسلام قبول کرنے یا اس کو ماننے کا دعویٰ یا اظہار کرلے اس کو ہم دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی سے منافقت اور تناقض کو خارج کردے اور جب وہ مسلمان ہے، یا بنا ہے تو مخلص مسلمان بنے اور اسلام کے رنگ میں رنگ کر یک رنگ ہو جائے۔

(۳) یہ کہ زندگی کا نظام جو آج باطل پرستوں اور فساق و فجار کی رہنمائی اور قیادت و فرمانروائی میں چل رہا ہے اور معاملاتِ دنیا کے نظام کی زمامِ کار جو خدا کے باغیوں کے ہاتھ میں آگئی ہے، ہم یہ دعوت دیتے

ہیں کہ اُسے بدلا جائے اور رہنمائی و امامت نظری و عملی دونوں حیثیتوں سے مومنین و صالحین کے ہاتھ میں منتقل ہو۔

یہ تینوں نکات اگرچہ اپنی جگہ بالکل صاف ہیں، لیکن ایک مدّتِ دراز سے ان پر غفلتوں اور غلط فہمیوں کے پردے پڑے رہے ہیں، اس لیے بدقسمتی سے آج غیر مسلموں کے سامنے ہی نہیں، بلکہ مسلمانوں کے سامنے بھی ان کی تشریح کی ضرورت پیش آگئی ہے۔

بندگیٔ رَب کا مفہوم

اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دینے کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ خدا کو خدا اور اپنے آپ کو خدا کا بندہ تو مان لیا جائے مگر اس کے بعد اخلاقی و عملی اور اجتماعی زندگی ویسی کی ویسی ہی رہے جیسی خدا کو نہ ماننے اور اس کی بندگی کا اعتراف نہ کرنے کی صورت میں ہوتی ہے۔ اسی طرح خدا کی بندگی کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ خدا کو فوق الفطری طریقے پر خالق اور رازق اور معبود تسلیم کر لیا جائے مگر عملی زندگی کی فرمانروائی و حکمرانی سے اس کو بے دخل کر دیا جائے۔ اسی طرح خدا کی بندگی کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ زندگی کو مذہبی اور دنیوی دو الگ الگ حصّوں میں تقسیم کیا جائے۔ اور صرف مذہبی زندگی میں جس کا تعلق عقائد اور عبادات اور حرام و حلال کی چند محدود قیود سے سمجھا جاتا ہے، خدا کی بندگی کی جائے۔ باقی رہے دُنیوی معاملات جو تمدّن، معاشرت، سیاست، معیشت، علوم و فنون اور ادب وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں تو ان میں انسان خدا کی بندگی

سے بالکل آزاد رہے اور جس نظام کو چاہے خود وضع کرے یا دوسروں کے وضع کیے ہوئے کو اختیار کرے۔ بندگیٔ رب کے ان سب مفہومات کو ہم سراسر غلط سمجھتے ہیں۔ ان کو مٹانا چاہتے ہیں۔ اور ہماری لڑائی جتنی شدت کے ساتھ نظامِ کفر کے ساتھ ہے، اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ شدت کے ساتھ بندگی کے ان مفہومات کے خلاف ہے۔ کیوں کہ ان کی بدولت دین کا تصوّر ہی سرے سے مسخ ہو گیا ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن اور اس سے پہلے کی تمام آسمانی کتابیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ سے پہلے کے تمام پیغمبر، جو دنیا کے مختلف گوشوں میں آئے، ان کی بالاتفاق دعوت جس بندگیٔ رب کی طرف تھی، وہ یہ تھی کہ انسان خدا کو پُورے معنیٰ میں الٰہ اور رب، معبود اور حاکم، آقا اور مالک، رہنما اور قانون ساز، محاسب اور مُجازِی (جزا دینے والا) تسلیم کرے، اور اپنی پُوری زندگی کو خواہ وہ شخصی Private ہو یا اجتماعی، اخلاقی ہو یا مذہبی، تمدنی و سیاسی اور معاشی ہو یا علمی اور نظری، اسی ایک خدا کی بندگی میں سپرد کر دے۔ یہی مطالبہ ہے جو قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے کہ اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً تم پُورے کے پُورے اسلام میں داخل ہو جاؤ، یعنی اپنی زندگی کے کسی پہلو اور کسی شعبے کو بندگیٔ رب سے محفوظ Reserve کر کے نہ رکھو۔ اپنے تمام وجود کے ساتھ اپنی پُوری ہستی کے ساتھ خدا کی غلامی و اطاعت میں آجاؤ۔ زندگی کے کسی معاملہ میں بھی تمہارا یہ طرزِ عمل نہ ہو کہ اپنے آپ کو خدا کی بندگی سے آزاد سمجھو

اور اس کی رہنمائی اور ہدایت سے مستغنی ہو کر اور اس کے مقابلے میں خود مختار بن کر یا کسی خود مختار بنے ہوئے بندے کے پیرو یا مطیع ہو کر وہ راہ چلنے لگو، جس کی ہدایت خود خدا نے نہ دی ہو۔ بندگی کا یہی وہ مفہوم ہے جس کی ہم تبلیغ کرتے ہیں اور جسے قبول کرنے کی سب لوگوں کو ـــــ مسلمانوں اور غیر مسلموں سب کو ـــــ دعوت دیتے ہیں۔

منافقت کی حقیقت

دوسری چیز جس کی ہم دعوت دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسلام کی پیروی کا دعویٰ کرنے والے یا اسلام قبول کرنے والے سب لوگ منافقانہ رویّے کو بھی چھوڑیں اور اپنی زندگی کو تناقضات Incensistancies سے بھی پاک کریں۔ منافقانہ رویّے سے ہماری مراد یہ ہے کہ آدمی جس دین کی پیروی کا دعویٰ کرے اس کے بالکل برخلاف نظامِ زندگی کو اپنے اوپر حاوی و مسلّط پا کر راضی و مطمئن رہے۔ اس کو بدل کر اپنے دین کو اس کی جگہ قائم کرنے کی کوئی سعی نہ کرے بلکہ اس کے برعکس اسی فاسقانہ و باغیانہ نظامِ زندگی کو اپنے لیے سازگار بنانے اور اس میں اپنے لیے آرام کی جگہ پیدا کرنے کی فکر کرتا رہے، یا اگر اس کو بدلنے کی کوشش بھی کرے تو اس کی غرض یہ نہ ہو کہ اس فاسقانہ نظامِ زندگی کی جگہ دینِ حق قائم ہو بلکہ صرف یہ کوشش کرے کہ ایک فاسقانہ نظام ہٹ کر، دوسرا فاسقانہ نظام اس کی جگہ قائم ہو جائے۔ ہمارے نزدیک یہ طرزِ عمل سراسر منافقانہ ہے۔ اس لیے کہ ہمارا ایک نظامِ زندگی پر ایمان رکھنا اور دوسرے نظامِ زندگی

میں راضی رہنا بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں، مخلصانہ ایمان کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ جس طریقِ زندگی پر ہم ایمان رکھتے ہیں اسی کو ہم اپنا قانونِ حیات دیکھنا چاہیں اور ہماری روح اپنی آخری گہرائیوں تک ہر اس رکاوٹ کے پیش آجانے پر بیچین و مضطرب ہو جائے، جو اس طریقِ زندگی کے مطابق جینے میں سدِّ راہ بن رہی ہو۔ ایمان تو ایسی کسی چھوٹی سے چھوٹی رکاوٹ کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا، کجا کہ اس کا پورا کا پورا دین کسی دوسرے نظامِ زندگی کا تابع مہمل بن کر رہ گیا ہو۔ اس دین کے کچھ اجزاء پر عمل ہوتا بھی ہو، تو صرف اس وجہ سے کہ غالب نظامِ زندگی نے ان کو بے ضرر سمجھ کر رعایتہً باقی رکھا ہو، اور ان رعایات Concessions کے ماسوا ساری زندگی کے معاملات دین کی بنیادوں سے ہٹ کر غالب نظامِ زندگی کی بنیادوں پر چل رہے ہوں اور پھر بھی ایمان اپنی جگہ نہ صرف خوش اور مطمئن ہو، بلکہ جو کچھ بھی سوچے اسی غلبۂ کفر کو اصولِ موضوعہ کے طور پر تسلیم کر کے سوچے۔ اس قسم کا ایمان چاہے فقہی اعتبار سے معتبر ہو لیکن دینی لحاظ سے تو اس میں اور نفاق میں کوئی فرق نہیں ہے، اور قرآن کی متعدد آیات اس بات پر شاہد ہیں کہ یہ حقیقت میں نفاق ہی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جو لوگ بھی اپنے آپ کو بندگیٔ رب کے اس مفہوم کے مطابق جس کی ابھی میں نے تشریح کی ہے، خدائے واحد کی بندگی میں دینے کا اقرار کریں ان کی زندگی اس نفاق سے پاک ہو۔ بندگیٔ حق کے اس مفہوم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سچے دل سے یہ چاہیں کہ

جو طریقِ زندگی، جو قانونِ حیات، جو اصولِ تمدّن و اخلاق و معاشرت و سیاست، جو نظامِ فکر و عمل اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے واسطے سے ہمیں دیا ہے ہماری زندگی کا پورا پورا کاروبار اُسی کی پیروی میں چلے اور ہم ایک لمحے کے لیے بھی اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے شعبے کے اندر بھی اس نظامِ حق کے خلاف کسی دوسرے نظام کے تسلّط کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ اب آپ خود سمجھ لیں کہ نظامِ باطل کے تسلّط کو برداشت کرنا بھی جبکہ تقاضائے ایمان کے خلاف ہو تو اس پر راضی و مطمئن رہنا اور اس کے قیام و بقاء کی سعی میں حصّہ لینا، یا ایک نظامِ باطل کی جگہ دوسرے نظامِ باطل کو سرفراز کرنے کی کوشش کرنا ایمان کے ساتھ کیسے میل کھا سکتا ہے؟

تناقض کی حقیقت

اس نفاق کے بعد دوسری چیز جس کو ہم پُرانے اور نئے مسلمان کی زندگی سے خارج کرنا چاہتے ہیں، اور جس کے خارج کرنے کی ہر مدعیِ ایمان کو دعوت دیتے ہیں وہ تناقض ہے۔ تناقض سے ہماری مراد یہ ہے کہ آدمی جس چیز کا زبان سے دعویٰ کرے عمل سے اس کی خلاف ورزی کرے۔ نیز یہ بھی تناقض ہے کہ آدمی کا اپنا عمل ایک معاملے میں کچھ ہو اور دوسرے معاملے میں کچھ۔ اس لیے اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُس نے اپنی پوری زندگی کو خدا کی بندگی میں دے دیا ہے تو اسے جان بُوجھ کر کوئی حرکت بھی ایسی نہ کرنی چاہیے جو بندگیٔ رب کی ضد ہو۔ اور

اگر بشری کمزوری کی بنا پر ایسی کوئی حرکت اس سے سرزد ہو جائے تو اِسے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے پھر بندگیٔ رب کی طرف پلٹنا چاہیے۔ ایمان کے مقتضیات میں سے یہ بھی ایک اہم مقتضا ہے کہ پوری زندگی صبغۃ اللہ میں رنگی ہوئی ہو۔ پچرنگی اور چورنگی تو درکنار دورنگی زندگی بھی دعوائے ایمان کے ساتھ میل نہیں کھاتی۔ ہمارے نزدیک یہ بات بہروپئے پن سے کم نہیں ہے کہ ہم ایک طرف تو خدا اور آخرت اور وحی اور نبوت اور شریعت کو ماننے کا دعویٰ کریں اور دوسری طرف دنیا کی طلب میں لپکے ہوئے ان درسگاہوں کی طرف خود دوڑیں، دوسروں کو ان کا شوق دلائیں، اور آپ خود اپنے اہتمام میں ایسی درسگاہیں چلائیں جن میں انسان کو خدا سے دُور کرنے والی، آخرت کو بھلا دینے والی، مادّہ پرستی میں غرق کر دینے والی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک طرف ہم خدا کی شریعت پر ایمان رکھنے کا دعوے کریں، اور دوسری طرف ان عدالتوں کے وکیل اور جج بنیں اور انہی عدالتوں کے فیصلوں پر حق اور غیر حق کے فیصلہ کا دارومدار رکھیں جو شریعتِ الٰہی کو ایوانِ عدالت سے بے دخل کر کے شریعتِ غیر الٰہی کی بنیاد پر قائم کی گئی ہوں۔ ایک طرف ہم مسجد میں جا جا کر نمازیں پڑھیں اور دوسری طرف مسجد سے باہر نکلتے ہی اپنے گھر کی زندگی میں، اپنے لین دین میں، اپنی معاش کی فراہمی میں، اپنی شادی بیاہ میں، اپنی میراثوں کی تقسیم میں، اپنی سیاسی تحریکوں میں اور اپنے سارے دنیوی معاملات میں خدا اور اس کی شریعت کو بھول کر، کہیں اپنے نفس کے

قانون کی، کہیں اپنی برادری کے رواج کی، کہیں اپنی سوسائٹی کے طور طریقوں کی، اور کہیں خدا سے پھرے ہوئے حکمرانوں کے قوانین کی پیروی میں کام کرنے لگیں، ایک طرف ہم اپنے خدا کو بار بار یقین دلائیں کہ ہم تیرے ہی بندے ہیں اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف ہر اُس بُت کی پوجا کریں جس کے ساتھ ہمارے مفاد ہماری دلچسپیاں اور ہماری محبّتیں اور آسائشیں کچھ بھی وابستگی رکھتی ہوں۔ یہ اور ایسے ہی بے شمار تناقضات جو آج مسلمانوں کی زندگی میں پائے جاتے ہیں جن کے موجود ہونے سے کوئی ایسا شخص جو بینائی رکھتا ہو انکار نہیں کر سکتا، ہمارے نزدیک وہ اصلی گھُن ہیں، جو امتِ مسلمہ کی سیرت و اخلاق کو اور اس کے دین و ایمان کو اندر ہی اندر کھائے جاتے ہیں، اور آج زندگی کے ہر پہلو میں مسلمانوں سے جن کمزوریوں کا اظہار ہو رہا ہے، اُن کی اصل جڑ یہی تناقضات ہیں، ایک مدّت تک مسلمانوں کو یہ اطمینان دلایا جاتا رہا ہے کہ تم شہادت توحید و رسالت زبان سے ادا کرنے اور روزہ و نماز وغیرہ چند مذہبی اعمال کر لینے کے بعد خواہ کتنے ہی غیر دینی اور غیر ایمانی طرزِ عمل اختیار کر جاؤ، بہر حال نہ تمہارے اسلام پر کوئی آنچ آ سکتی ہے، اور نہ تمہاری نجات کو کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، حتّٰی کہ اس ڈھیل Allowance کی حدود اس حد تک بڑھیں کہ نماز روزہ بھی مسلمان ہونے کے لیے شرط نہ رہا اور مسلمانوں میں عام طور پر یہ تخیّل پیدا کر دیا گیا کہ ایک طرف ایمان اور اسلام کا اقرار ہو، اور دوسری طرف ساری

زندگی اس کی ضد ہو، تب بھی کچھ نہیں بگڑتا۔ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ ۔ اسی چیز کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کے نام کے ساتھ ہر فسق، ہر کفر، ہر معصیت و نافرمانی اور ہر ظلم و سرکشی کا جوڑ آسانی سے لگ جاتا ہے اور مسلمان مشکل ہی سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ جن راہوں میں وہ اپنے اوقات، اپنی محنتیں، اپنے مال، اپنی قوتیں اور اپنی قابلیتیں اور اپنی جانیں کھپا رہے ہیں اور جن مقاصد کے پیچھے ان کی انفرادی اور اجتماعی کوششیں صرف ہو رہی ہیں وہ اکثر ان کے ایمان کی ضد ہیں، جس کا وہ دعویٰ رکھتے ہیں۔ یہ صورتِ حال جب تک جاری رہے گی، اسلام کے دائرے میں نو مسلموں کا داخلہ بھی کوئی مفید نتیجہ پیدا نہ کر سکے گا کیونکہ جو منتشر افراد اس کانِ نمک میں آتے جائیں گے وہ اسی طرح نمک بنتے چلے جائیں گے۔ پس ہماری دعوت کا ایک لازمی عنصر یہ ہے کہ ہم ہر مدعیٔ ایمان کی زندگی کو اِن تناقضات سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مطالبہ ہر مومن سے یہ ہے کہ وہ حنیف ہو، یکسُو ہو۔ ایک رُخ مومن و مسلم ہو۔ ہر اس چیز سے کٹ جائے، اور نہ کٹ سکتا ہو تو پیہم کٹنے کی جدوجہد کرتا رہے، جو ایمان کی ضد اور مسلمانہ طریقِ زندگی کے منافی ہو۔ اور خوب اچھی طرح مقتضیاتِ ایمان میں سے ایک ایک تقاضے کو سمجھے اور اُسے پُورا کرنے کی پیہم سعی کرتا رہے۔

امامت میں تغیّر کی ضرورت

اب ہماری دعوت کے تیسرے نکتہ کو لیجیے۔ ابھی جن دو نکات

کی تشریح میں آپ کے سامنے کر چکا ہوں یہ تیسرا نکتہ ان سے بالکل ایک منطقی نتیجے کے طور پر نکلتا ہے ہمارا اپنے آپ کو بندگیٔ رب کے حوالے کر دینا اور اس حوالگی و سپردگی میں ہمارا منافق نہ ہونا، بلکہ مخلص ہونا اور پھر ہمارا اپنی زندگی کو تناقضات سے پاک کر کے مسلم حنیف بننے کی کوشش کرنا، لازمی طور پر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس نظامِ زندگی میں انقلاب چاہیں جو آج کفر، دہریت، شرک، فسق و فجور اور بداخلاقی کی بنیادوں پر چل رہا ہے اور جس کے نقشے بنانے والے مفکّرین اور جس کا عملی انتظام کرنے والے مدبّرین سب کے سب خدا سے پھرے ہوئے اور اس کے شرائع کے قیود سے نکلے ہوئے لوگ ہیں۔ جب تک زمامِ کار ان لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی، اور جب تک علوم و فنون آرٹ اور ادب، تعلیم و تدریس، نشر و اشاعت، قانون سازی اور تنفیذ قانون، مالیات، صنعت و حرفت، تجارت اور انتظامِ مُلکی اور تعلقات بین الاقوامی، ہر چیز کی باگ ڈور یہ لوگ سنبھالے ہوئے رہیں گے، کسی شخص کے لیے دُنیا میں مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا اور خدا کی بندگی کو اپنا ضابطۂ حیات بنا کر رہنا نہ صرف عملاً محال ہے بلکہ اپنی آئندہ نسلوں کو اعتقاداً بھی اسلام کا پیرو چھوڑ جانا غیر ممکن ہے۔ اس کے علاوہ صحیح معنوں میں جو شخص بندۂ رب ہو، اس پر منجملہ دوسرے فرائض کے ایک اہم ترین فرض یہ بھی عاید ہوتا ہے کہ وہ خدا کی رضا کے مطابق دنیا کے انتظام کو فساد سے پاک کرے اور اصلاح پر قائم کرے، اور یہ ظاہر

بات ہے کہ یہ مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک زمامِ کار صالحین کے ہاتھ میں نہ ہو، فساق و فجار اور خدا کے باغی اور شیطان کے مطیع، دنیا کے امام و پیشوا اور منتظم رہیں۔ اور پھر دنیا میں ظلم و فساد، بداخلاقی اور گمراہی کا دَور دَورہ نہ ہو۔ یہ عقل اور فطرت کے خلاف ہے اور آج تجربہ و مشاہدے سے کالشمس فی النہار ثابت ہو چکا ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ پس ہمارا مسلم ہونا خود اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم دنیا کے ائمۂ ضلالت کی پیشوائی ختم کر دینے اور غلبۂ کفر و شرک کو مٹا کر دینِ حق کو اس جگہ قائم کرنے کی سعی کریں۔

امامت میں انقلاب کیسے ہوتا ہے؟

مگر یہ تغیّر چاہنے سے نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیّت بہرحال دنیا کا انتظام چاہتی ہے اور دنیا کے انتظام کے لیے کچھ صلاحیتیں اور قوتیں اور صفات درکار ہیں، جن کے بغیر کوئی گروہ اس انتظام کو ہاتھ میں لینے اور چلانے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ اگر مومنین صالحین کا ایک منظم جتھا ایسا موجود نہ ہو جو انتظامِ دنیا کو چلانے کی اہلیّت رکھتا ہو تو پھر مشیّتِ الٰہی غیر مومن اور غیر صالح لوگوں کو اپنی دنیا کا انتظام سونپ دیتی ہے۔ لیکن اگر کوئی گروہ ایسا موجود ہو جو ایمان بھی رکھتا ہو، صالح بھی ہو، اور ان صفات اور صلاحیّتوں اور قوتوں میں کفار سے بڑھ جائے، جو دنیا کا انتظام چلانے کے لیے ضروری ہیں تو مشیّتِ الٰہی نہ ظالم ہے اور نہ فساد پسند کہ پھر بھی اپنی دنیا کا انتظام فساق و فجار اور کفار ہی کے ہاتھ میں رہنے دے۔ پس ہماری دعوت صرف اسی حد تک نہیں کہ دنیا کی زمامِ کار فسّاق و فجّار کے ہاتھ سے نکل کر

مومنین صالحین کے ہاتھ میں آئے بلکہ ایجاباً Positively ہماری دعوت یہ ہے کہ اہلِ ایمان وصلاح کا ایک ایسا گروہ منظم کیا جائے جو نہ صرف اپنے ایمان میں پختہ ہو، نہ صرف اپنے اسلام میں مخلص و یک رنگ اور نہ صرف اپنے اخلاق میں صالح و پاکیزہ ہو بلکہ اس کے ساتھ ان تمام اوصاف اور قابلیتوں سے بھی آراستہ ہو جو دنیا کی کارگاہِ حیات کو بہترین طریقے پر چلانے کے لیے ضروری ہیں، اور صرف آراستہ ہی نہ ہو بلکہ موجودہ کارفرماؤں اور کارکنوں سے ان اوصاف اور قابلیتوں میں اپنے آپ کو فائق تر ثابت کر دے۔

مخالفت اور اس کے اسباب

یہ ہے ہماری دعوت کا خلاصہ۔ اب آپ تعجب کریں گے اگر میں آپ کو بتاؤں کہ اس دعوت کی مزاحمت اور مخالفت سب سے پہلے جس گروہ کی طرف سے ہوئی ہے وہ مسلمانوں کا گروہ ہے۔ اس وقت تک غیر مسلموں کی طرف سے ہمارے خلاف نہ کوئی آواز اُٹھی ہے اور نہ عملاً کوئی مزاحمت و مخالفت ہوئی ہے[1]۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ آئندہ بھی یہی صورتِ حال رہے گی، نہ یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کب تک یہ صورتِ حال رہے گی، مگر بہرحال یہ واقعہ اپنی جگہ نہایت دردناک اور افسوسناک ہے کہ اس دعوت کو سُن کر ناک بھوں چڑھانے والے، اسے اپنے لیے خطرہ سمجھنے والے اور اس کی مزاحمت میں سب سے آگے بڑھ کر سعی کرنے والے

---

[1] واضح رہے کہ یہ بات تقسیم سے قبل کے حالات سے متعلق تھی۔ (ناشر)

غیر مسلم نہیں بلکہ مسلمان ہیں۔ شاید ایسی ہی کچھ صورتِ حال ہوگی جس میں اہلِ کتاب سے فرمایا گیا تھا ولا تکونوا اوّل کافرٍ بہٖ[1]۔ ہمیں ہندوؤں، سکھوں اور انگریزوں تک سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا ہے مگر بہت کم ایسا اتفاق ہوا کہ ان لوگوں میں سے کسی نے ہمارے لٹریچر کو پڑھ کر یا ہمارے مدعا کو تفصیل کے ساتھ ہماری زبان سے سُن کر یہ کہا ہو کہ یہ "حق" نہیں ہے یا یہ کہ اگر تم اس چیز کو قائم کرنے کی کوشش کرو گے تو ہم ایڑی سے چوٹی تک کا زور تمہاری مزاحمت میں لگا دیں گے"۔ متعدد غیر مسلم ہم کو ایسے بھی ملے ہیں جنہوں نے بے اختیار ہو کر کہا کہ کاش یہی اسلام ہندوستان میں پیش کیا گیا ہوتا اور اسی کو قائم کرنے کے لیے باہر سے آنے والے اور اندر سے قبول کرنے والے مسلمانوں نے کوشش کی ہوتی تو آج ہندوستان کا یہ نقشہ نہ ہوتا اور اس ملک کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ بعض غیر مسلموں نے ہم سے یہاں تک کہا کہ "اگر فی الواقعہ ایسی ایک سوسائٹی موجود ہو جو پوری دیانت کے ساتھ انہی اصولوں پر چلے اور جس کا مرنا اور جینا سب اسی ایک مقصد کے لیے ہو تو ہمیں اس کے اندر شامل ہونے میں کوئی تامل نہ ہوگا"۔ لیکن اس کے برعکس ہماری مخالفت میں سرگرم اور ہمارے متعلق بدگمانیاں پھیلانے اور ہم پر ہر طرح کے الزام لگانے والے اگر کسی گروہ میں سب سے پہلے اُٹھے تو وہ مسلمانوں کا گروہ ہے اور ان میں بھی سب سے زیادہ یہ شرف مذہبی طبقے کے حضرات کو حاصل ہوا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ آج تک کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ

---

[1] اور تم سب سے پہلے اس کا انکار کرنے والے نہ بنو۔

جس چیز کی دعوت تم لوگ دیتے ہو وہ باطل ہے۔ شاید اس دعوت پر سامنے سے حملہ Frontal attach ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے مجبوراً کبھی عقب سے اور کبھی دائیں پہلو سے اور کبھی بائیں جانب سے چھاپے مارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ بات تو حق ہے مگر اس کی دعوت دینے والا ایسا اور ایسا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اس کے حق ہونے میں تو کلام نہیں مگر اس زمانے میں یہ چلنے والی چیز نہیں ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ حق تو یہی ہے مگر اس کا علم بلند کرنے کے لیے صحابہ کرام جیسے لوگ درکار ہیں اور وہ بھلا اب کہاں آ سکتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اس کے صداقت ہونے میں کوئی شبہ نہیں مگر مسلمان اپنی موجودہ سیاسی و معاشی پوزیشن میں اس دعوت کو اپنی واحد دعوت کیسے بنا سکتے ہیں۔ ایسا کریں تو ان کی دنیا تباہ ہو جائے گی اور تمام سیاسی اور معاشی زندگی پر غیر مسلم قابض ہو کر ان کے لیے سانس لینے تک کی جگہ نہ چھوڑیں۔ پھر جب اس مسلمان قوم میں سے کوئی اللہ کا بندہ ایسا نکل آتا ہے جو ہماری اس دعوت کو قبول کر کے اپنی زندگی کو واقعی نفاق و تناقض سے پاک کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی پوری زندگی کو بندگیٔ رب میں دے ڈالنے کا تہیہ کر لیتا ہے تو سب سے پہلے اس کی مخالفت کرنے کے لیے اس کے اپنے بھائی بند، اس کے ماں باپ، اعزا اور اقرباء، برادری کے لوگ اور دوست آشنا کھڑے ہو جاتے ہیں، اچھے اچھے متقی اور دیندار آدمی بھی جن کی پیشانیوں پر نمازیں پڑھتے

پڑھتے گئے پڑ چکے ہیں اور جن کی زبانیں مذہبیت کی باتوں سے ہر وقت تر رہتی ہیں اس بات کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ ان کا بیٹا یا بھائی یا کوئی عزیز جس کا دنیوی مفاد انہیں کسی درجے میں بھی محبوب ہو اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈالے۔

یہ بات کہ اس دعوت کی مخالفت سب سے پہلے مسلمانوں نے کی اور ان میں سے بھی اہلِ دنیا نے نہیں بلکہ اہلِ دین نے کی، ایک بہت بڑی بیماری کا پتہ دیتی ہے جو مدّتوں سے پرورش پا رہی تھی۔ مگر ظاہر فریب پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ آج اگر ہم محض علمی رنگ میں اس دعوت کو پیش کرتے اور یہ نہ کہتے کہ آؤ اس چیز کو عمل میں لانے اور بالفعل قائم کرنے کی کوشش کریں تو آپ دیکھتے کہ مخالفت کے بجائے ان مزیدار علمی باتوں پر ہر طرف سے تحسین و آفرین ہی کی صدائیں بلند ہوتیں۔ بھلا کوئی مسلمان ایسا بھی ہو سکتا ہے جو کہہ سکے کہ بندگی خدا کے سوائے کسی اور کی ہونی چاہیے، یا یہ کہ مسلمان کو نفاق کی حالت میں اور منافی ایمان اعمال میں مبتلا رہنا چاہیے، یا یہ کہ زمامِ کار مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ کفار ہی کے ہاتھ میں رہنی چاہیے، یا شریعتِ الٰہی کو نہیں کفر ہی کے قوانین کو دنیا میں جاری رہنا چاہیے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک جن چیزوں کی ہم نے دعوت دی ہے ان میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جسے ہم دعوتِ عمل کے بغیر صرف علمی حیثیت سے پیش کرتے تو مسلمانوں میں سے کوئی گروہ بلکہ کوئی فرد اس کے خلاف زبان کھولنے پر آمادہ ہوتا۔

لیکن جس چیز نے لوگوں کو مخالفت پر آمادہ کیا وہ صرف یہ ہے کہ ہم ان باتوں کو فقط علمی رنگ میں ہی نہیں پیش کرتے بلکہ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ آؤ جس چیز کو از روئے ایمان حق جانتے ہو اسے عملاً پہلے اپنی زندگی میں اور پھر اپنے گرد و پیش دنیا کی زندگی میں قائم و جاری کرنے کی کوشش کرو۔ یہ بعینہٖ وہی صورت حال ہے جو اس سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت پیش آ چکی ہے۔ جو لوگ عرب جاہلیّت کے لٹریچر پر نگاہ رکھتے ہیں ان سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس توحید کی دعوت دی تھی اور جن اصولِ اخلاص کو آپ پیش فرماتے تھے وہ عرب میں بالکل نئی چیز نہ تھے۔ اسی قسم کے موحدانہ خیالات زمانہ جاہلیّت کے متعدد شعراء اور خطیب پیش کر چکے تھے اور اسی طرح اسلامی اخلاقیات میں سے بھی بیشتر وہ تھے جن کو اہلِ عرب کے حکماء اور خطباء اور شعراء بیان کرتے رہے تھے۔ مگر فرق جو کچھ تھا وہ یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف تو باطل کی آمیزشوں سے الگ کر کے خالص حق کو ایک مکمل و مرتب نظام زندگی کی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کیا اور دوسری طرف آپ نے یہ بھی چاہا کہ جس توحید کو ہم حق کہتے ہیں اس کے مخالف عناصر کو ہم اپنی زندگی سے خارج کر دیں اور سارے نظامِ زندگی کو اسی توحید کی بنیاد پر تعمیر کریں۔ نیز یہ کہ جن اصُول اخلاق کو ہم معیار تسلیم کرتے ہیں، ہماری پوری زندگی کا نظام بھی انہی اصولوں پر عملاً قائم ہو۔ یہی سبب تھا کہ جن باتوں کے کہنے پر زمانۂ جاہلیّت کے

کسی خطیب، کسی شاعر اور کسی حکیم کی مخالفت نہیں کی گئی بلکہ اُلٹا انہیں سراہا گیا۔ انہی باتوں کو جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تو ہر طرف سے مخالفتوں کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا، کیونکہ لوگ اس بات کے لیے تیار نہیں تھے کہ شرک پر جو نظامِ زندگی قائم تھا اُسے بالکل ادھیڑ کر از سرِ نو توحید کی بُنیادوں پر قائم کیا جائے اور اس طرح ان تمام تعصّبات اور آبائی رسموں کا، امتیازات اور "حقوق" اور مناصب کا، اور اعزازات و اکرامات اور معاشی مفادات کا یک لخت خاتمہ ہو جائے جو صدہا برس سے عہدِ جاہلیّت میں زندگی کی بنیاد بنے ہوئے تھے۔ اور جن سے بعض طبقوں اور خاندانوں کی اغراض وابستہ تھیں۔ اسی طرح لوگ اس بات کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ اخلاقِ فاسدہ کے رواج سے جو آسائشیں اور لذّتیں اور منفعتیں اور آزادیاں ان کو حاصل ہیں ان سے دست بردار ہو جائیں اور اخلاق صالحہ کی بندشوں میں اپنے آپ کو خود کسوالیں۔ یہ معاملہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ پیش نہیں آیا بلکہ حضورؐ سے پہلے جتنے نبی گذرے ہیں ان کی مخالفت بھی زیادہ تر اسی مسئلے پر ہوئی ہے۔ اگر انبیاء صرف علمی اور ادبی حیثیّت سے توحید اور آخرت اور اخلاق فاضلہ کا ذکر کرتے تو ان کے زمانے کی سوسائٹیاں اسی طرح ان کو برداشت کرتیں بلکہ سر آنکھوں پر بٹھاتیں جس طرح انہوں نے مختلف قسم کے شاعروں اور فلسفیوں اور ادیبوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ لیکن ہر نبی کا مطالبہ ان باتوں کے ساتھ یہ بھی تھا کہ: اِتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (اللہ سے ڈرو

اور میری اطاعت کرو)۔ لَا تُطِيْعُوْا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ (حد سے گذر جانے والوں کی اطاعت نہ کرو) اور اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَاءَ (جو ہدایت تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو) اور پھر انبیاء نے اس پر بھی اکتفا نہ کیا بلکہ ایک مستقل تحریک اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے جاری کی اور اپنے پیروؤں کے جتھے منظم کر کے عملاً نظامِ تہذیب و تمدن و اخلاق کو اپنے نصب العین کے مطابق بدل ڈالنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ بس یہی وہ نقطہ تھا جہاں سے ان لوگوں کی مخالفت کا آغاز ہوا۔ جن کے مفاد نظامِ جاہلیت سے کلّی یا جزئی طور پر وابستہ تھے۔ اور آج ہم مشاہدہ کر رہے ہیں کہ ٹھیک یہی نقطہ ہے جہاں سے ہماری مخالفت کی ابتدا ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے ایک طویل مدّت سے اپنی پوری زندگی کی عمارت ان بہت سی مصالحتوں Compromises پر قائم کر رکھی ہے جو نظامِ جاہلیّت کے اور ان کے درمیان طے ہو چکے ہیں۔ یہ مصالحتیں صرف دنیادارانہ ہی نہیں ہیں بلکہ انہوں نے اچھی خاصی مذہبی نوعیّت بھی اختیار کر لی ہے۔ بڑے بڑے مقدّس لوگ جن کے تقدس کی قسمیں کھائی جا سکتی ہیں، ان مصالحتوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نظامِ باطل کی وابستگی کے ساتھ تقویٰ اور عبادت کے چند مظاہر اس قدر کافی قرار دیئے جا چکے ہیں کہ بکثرت لوگ انہی پرہیزگاریوں اور عبادت گذاریوں پر اپنی

نجات کی طرف سے مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں۔ بہت سے اربابِ فضل اور اصحابِ مقاماتِ عالیہ ایسے موجود ہیں جن کی بزرگی اور روحانیت، اور جن کے اونچے مراتب، نظامِ جاہلیّت کے ساتھ مصالحت کر لینے کے باوجود قائم ہیں، زبان سے کفر و جاہلیّت اور فسق و فجور اور بد اعتقادیوں اور ضلالتوں کی مذمّت کر لینا اور عہدِ صحابہ کے نقشے بڑی طلاقتِ لسانی کے ساتھ اپنے وعظوں اور اپنی تحریروں میں کھینچ دینا اسلام کا حق ادا کرنے کے لیے بالکل کافی ہو چکا ہے اور اس کے بعد ان حضرات کے لیے بالکل حلال ہے کہ خود اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو اور اپنے متعلّقین اور اپنے پیروؤں کو اسی نظامِ باطل کی خدمت میں لگا دیں جس کے لائے ہوئے سیلاب ضلالت و گمراہی اور طوفانِ فسق و فجور کی یہ دن رات مذمت کرتے رہتے ہیں۔ اِن حالات میں جب ہم دینِ حق اور اس کے مطالبات اور مقتضیات کو محض علمی حیثیّت ہی سے پیش کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ یہ دعوت بھی دیتے ہیں کہ غلط نظام کے ساتھ وہ تمام مصالحتیں ختم کر دو جو تم نے کر رکھی ہیں اور کامل یکسوئی و یک رنگی کے ساتھ حق کی پیروی اختیار کر لو اور پھر اس باطل کی جگہ اس حق کو قائم کرنے کے لیے جان و مال اور وقت و محنت کی قربانی دو جس پر تم ایمان لائے ہو تو ظاہر ہے کہ یہ قصور ایسا نہیں ہے جسے معاف کیا جا سکے۔ اگر سیدھی طرح یہ تسلیم کر لیا جائے کہ واقعی دین کے مطالبات اور مقتضیات یہی ہیں اور حقیقت میں حنفیت اسی کو کہتے ہیں اور اصل بات یہی ہے کہ نظامِ باطل کے ساتھ مومن کا تعلق مصالحت

کا نہیں بلکہ نزاع و کشمکش کا ہونا چاہیے تو پھر دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے، یا تو اپنے مفاد کی قربانی گوارا کر کے اس جدوجہد میں حصّہ لیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ بہت جاں گسل بات ہے، یا پھر اعتراف کر لیا جائے کہ حق تو یہی ہے مگر ہم اپنی کمزوری کی وجہ سے اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ لیکن یہ اعتراف بھی مشکل ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے صرف یہی نہیں کہ نجات کی وہ گارنٹی خطرے میں پڑ جاتی ہے جس کے اطمینان پر اب تک زندگی بسر کی جا رہی تھی بلکہ اس طرح وہ مقام تقدّس بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے جو مذہبی و روحانی حیثیت سے ان حضرات کو حاصل رہا ہے۔ اور یہ چیز بھی بہر حال ٹھنڈے پیٹوں گوارا نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے ایک بڑے گروہ نے مجبوراً یہ تیسری راہ اختیار کی ہے کہ صاف صاف ہماری اس دعوت کو باطل تو نہ کہا جائے۔ کیونکہ باطل کہنے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن صاف صاف اس کے حق ہونے کا بھی اعتراف نہ کیا جائے اور اگر کہیں اس کی حقانیت کا اقرار کرنا پڑ ہی جائے تو پھر اصول کو چھوڑ کر کسی شخص یا اشخاص کو بدگمانیوں اور الزامات کا ہدف بنایا جائے تاکہ خود اپنے ہی مانے ہوئے حق کا ساتھ نہ دینے کے لیے وجہِ جواز پیدا ہو جائے۔ کاش یہ حضرات کبھی اس بات پر غور فرماتے کہ جو حجتیں جو آج بندوں کا منہ بند کرنے کے لیے وہ پیش کرتے ہیں کل قیامت کے روز کیا وہ خدا کا منہ بھی بند کر دیں گی؟

MOASSESAH AL IMAM KHOMEINI TRUST (REGD)
کتابخانہ امام خمینی

ہمارا طریقِ کار

اب میں آپ کے سامنے مختصر طور پر اس "طریقِ کار" کو پیش کروں گا جو ہم نے اپنی اس دعوت کے لیے اختیار کیا ہے۔ ہماری دعوت کی طرح ہمارا یہ طریقِ کار بھی دراصل قرآن اور انبیاء علیہم السلام کے طریقے سے ماخوذ ہے۔ جو لوگ ہماری دعوت کو قبول کرتے ہیں، ان سے ہمارا اوّلین مطالبہ یہی ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو عملاً اور بالکلیہ بندگیٔ رب میں دے دو۔ اور اپنے عمل سے اپنے اخلاص اور اپنی یکسوئی کا ثبوت دو اور ان تمام چیزوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنے کی کوشش کرو جو تمہارے ایمان کی ضد ہیں۔ یہیں سے ان کے اخلاق و سیرت کی تعمیر اور ان کی آزمائش کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں نے بڑی بڑی امنگوں Ambitions کے ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی انہیں اپنے اونچے اونچے خوابوں کی عمارتیں اپنے ہاتھ سے ڈھا دینی پڑتی ہیں۔ اور اس زندگی میں قدم رکھنا پڑتا ہے جس میں جاہ و منصب اور معاشی خوشحالیوں کے امکانات انہیں اپنی زندگی میں تو درکنار اپنی دوسری تیسری پشت میں بھی دُور دُور نظر نہیں آتے۔ جن لوگوں کی معاشی خوشحالی کسی مرہونہ زمین یا کسی مغصوبہ جائداد یا کسی ایسی میراث پر قائم تھی جس میں حقداروں کے حقوق مارے گئے تھے انہیں بسا اوقات دامن جھاڑ کر اس خوشحالی سے کنارہ کش ہو جانا پڑتا ہے۔ صرف اس لیے کہ جس خدا کو انہوں نے اپنا آقا تسلیم کیا

ہے اُس کے منشاء کے خلاف کسی مال کا کھانا ان کے ایمان کے منافی ہے۔
جن لوگوں کے وسائلِ زندگی غیر شرعی تھے یا نظامِ باطل سے وابستہ تھے
ان کو ترقیوں کے خواب دیکھنا تو درکنار موجودہ وسائل سے حاصل کی
ہوئی روٹی کا بھی ایک ایک ٹکڑا حلق سے اتارنا ناگوار ہونے لگتا ہے۔
اور وہ ان وسائل کو پاک تر وسائل سے خواہ وہ حقیر ترین ہی کیوں نہ ہوں،
بدلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگتے ہیں۔ پھر جیسا کہ ابھی میں آپ کے
سامنے بیان کر چکا ہوں، اس مسلک کو عملاً اختیار کرتے ہی آدمی کا قریب
ترین ماحول اس کا دشمن بن جاتا ہے۔ اس کے اپنے والدین، اس کے
بھائی بند، اس کی بیوی اور بچے اور اس کے جگری دوست سب سے پہلے
اس کے ایمان کے ساتھ قوت آزمائی شروع کر دیتے ہیں اور بسا اوقات
اس مسلک کا پہلا اثر ظاہر ہوتے ہی آدمی کا اپنا گھوارہ جس میں وہ نازوں
سے پالا گیا تھا، اس کے لیے زنبور خانہ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ ہے وہ
ابتدائی تربیت گاہ جو صالح و مخلص اور قابلِ اعتماد و سیرت کے کارکن
فراہم کرنے کے لیے قدرت الٰہی نے ہمارے لیے خود بخود پیدا کر دی
ہے۔ ان ابتدائی آزمائشوں میں جو لوگ ناکام ہو جاتے ہیں وہ آپ سے
آپ چھٹ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ اور ہمیں ان کو چھانٹ پھینکنے کی زحمت
گوارا نہیں کرنی پڑتی۔ اور جو لوگ ان میں پورے اُترتے ہیں وہ ثابت کر
دیتے ہیں کہ ان کے اندر کم از کم اتنا اخلاص، اتنی یکسوئی، اتنا صبر اور اتنا
عزم، اتنی محبتِ حق اور اتنی مضبوطیٔ سیرت ضرور موجود ہے جو خدا کی راہ

میں قدم رکھنے اور پہلے مرحلۂ امتحان سے کامیاب گذر جانے کے لیے ضروری ہے۔ اس مرحلے کے کامیاب لوگوں کو ہم نسبتاً زیادہ بھروسے اور اطمینان کے ساتھ لے کر دوسرے مرحلے کی طرف پیش قدمی کر سکتے ہیں جو آنے والا ہے اور جس میں اس سے زیادہ آزمائشیں پیش آنیوالی ہیں۔ وہ آزمائشیں پھر ایک دوسری بھٹی تیار کریں گی جو اسی طرح کھوٹے سکّوں کو چھانٹ کر پھینک دے گی اور زرِ خالص کو اپنی گود میں رکھ لیگی۔ جہاں تک ہمارا علم ساتھ دیتا ہے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی معاون سے کارآمد عناصر کو چھانٹنے اور ان کو زیادہ کارآمد بنانے کے لیے یہی طریقہ پہلے بھی اختیار کیا جاتا رہا ہے اور جو تقویٰ ان بھٹیوں میں تیار ہوتا ہے، چاہے وہ فقہی ناپ تول میں پُورا نہ اُترے، اور خانقاہی معیارِ پر بھی ناقص نکلے، مگر صرف اسی طرز سے تیار کیے ہوئے تقویٰ میں یہ طاقت ہو سکتی ہے کہ انتظامِ دنیا کی بھاری ذمّہ داریوں کا بوجھ سنبھال سکے اور ان عظیم الشان امانتوں کا بار اٹھا سکے جن کے ایک قلیل سے قلیل جز کا وزن بھی خانقاہی تقویٰ کی برداشت سے باہر ہے۔

اس کے ساتھ دوسری چیز جو ہم لازم رکھتے ہیں یہ ہے کہ جس حق کی روشنی ہم نے پائی ہے اس سے وہ اپنے قریبی ماحول کو اور ان سب لوگوں کو جن سے ان کا قرابت یا دوستی یا ہمسائیگی یا لین دین کا تعلق ہے روشناس کرانے کی کوشش کریں اور انہیں اس کی طرف آنے کی دعوت دیں۔ یہاں پھر آزمائشوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

سب سے پہلے تو اس تبلیغ کی وجہ سے مبلّغ کی اپنی زندگی درُست ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ کام شروع کرتے ہی بیشمار خوردبین اور دیدبان Searchlights اس کی ذات کی طرف متوجّہ ہو جاتے ہیں اور مبلّغ کی زندگی میں اگر کوئی چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی اس کے ایمان اور اس کی دعوت کے منافی موجود ہو تو یہ مفت کے محتسب اسے نمایاں کر کے مبلغ کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور تازیانے لگا لگا کر اسے مجبور کرتے ہیں کہ اپنی زندگی کو اس سے پاک کرے۔ اگر مبلّغ فی الواقع اس دعوت پر سچّے دل سے ایمان لایا ہو تو وہ ان تنقیدوں پر جھنجھلانے اور تاویلوں سے اپنے عمل کی غلطی کو چھپانے کی کوشش نہ کرے گا بلکہ ان لوگوں کی خدمات سے فائدہ اُٹھائے گا جو مخالفت کی نیّت ہی سے سہی مگر بہرحال اس کی اصلاح میں بغیر کسی معاوضے کے سعی و محنت کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس برتن کو بیسیوں ہاتھ مانجھنے میں لگ جائیں اور مانجھتے ہی چلے جائیں وہ چاہے کتنا ہی کثیف ہو آخر کار مجلّا و مصفّا ہو کر رہے گا۔

پھر اس تبلیغ سے ان لوگوں میں بہت سے اوصاف کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے جنہیں آگے چل کر دوسرے میدانوں میں کسی اور شکل سے استعمال کرنا ہے۔ جب مبلّغ کو طرح طرح کے دِل شکن حالات سے گزرنا پڑتا ہے، کہیں اس کی ہنسی اڑائی جاتی ہے، کہیں اس پر طعنے اور آوازے کسے جاتے ہیں، کہیں گالیوں اور دُوسری

جہالتوں سے اس کی تواضع کی جاتی ہے، کہیں اس پر الزامات کی بوچھاڑ کی جاتی ہے، کہیں اس کو فتنوں میں اُلجھانے کی نت نئی تدبیریں کی جاتی ہیں۔ کہیں اُسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے، میراث سے محروم کیا جاتا ہے، دوستیاں اور رشتہ داریاں اس سے منقطع کر لی جاتی ہیں اور اس کے لیے اپنے ماحول میں سانس تک لینا دشوار کر دیا جاتا ہے۔ تو ان حالات میں جو کارکن نہ ہمت ہارے، نہ حق سے پھرے، نہ باطل پرستوں کے آگے سپر ڈالے، نہ مشتعل ہو کر اپنے دماغ کا توازن کھوئے، بلکہ اس کے برعکس حکمت اور تدبر اور ثابت قدمی اور راستبازی اور پرہیزگاری اور ایک سچے حق پرست کی سی ہمدردی و خیر خواہی کے ساتھ اپنے مسلک پر قائم اور اپنے ماحول کی اصلاح میں پیہم کوشاں رہے۔ اس کے اندر ان اوصاف عالیہ کا پیدا ہونا اور نشوونما پانا یقینی ہے جو آگے چل کر ..... اس جدوجہد کے دوسرے مرحلوں میں اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر درکار ہوں گے۔

اس تبلیغ کے سلسلے میں ہم نے وہی طریق کار ..... اپنانے کی کوشش کی ہے جو قرآن مجید میں تعلیم فرمایا گیا ہے، یعنی یہ کہ حکمت اور موعظۂ حسنہ کے ساتھ خدا کے راستے کی طرف دعوت دیں، تدریج اور فطری ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے لوگوں کے سامنے دین کے اوّلین بُنیادی اصولوں کو اور پھر رفتہ رفتہ ان کے مقتضیات اور لوازم کو پیش کریں، کسی کو اس کی قوّتِ ہضم سے بڑھ کر خوراک دینے کی کوشش

نہ کریں، فروع کو اصول پر اور جزئیات کو کلیات پر مقدم نہ کریں، بنیادی خرابیوں کو رفع کیے بغیر ظاہری برائیوں اور بیرونی شاخوں کو چھانٹنے اور کاٹنے میں اپنا وقت ضائع نہ کریں، غفلت اور اعتقادی و عملی گمراہیوں میں پھنسے ہوئے لوگوں کے ساتھ نفرت و کراہیت کا برتاؤ کرنے کے بجائے ایک طبیب کی سی ہمدردی و خیر خواہی کے ساتھ ان کے علاج کی فکر کریں، گالیوں اور پتھروں کے جواب میں دعائے خیر کرنا سیکھیں، ظلم اور ایذا رسانی پر صبر کریں، جاہلوں سے بحثوں اور مناظروں، اور نفسانی مجادلوں میں نہ اُلجھیں، لغو اور بیہودہ باتوں سے عالی ظرف اور شریف لوگوں کی طرح درگذر کریں، جو لوگ حق سے مستغنی بنے ہوئے ہوں، ان کے پیچھے پڑنے کے بجائے ان لوگوں کی طرف توجّہ کریں جن کے اندر کچھ طلبِ حق پائی جاتی ہو، خواہ وہ دنیوی اعتبار سے کتنے ہی ناقابلِ توجّہ سمجھے جاتے ہوں، اور اپنی اس تمام سعی و جہد میں ریاء اور نمود و نمائش سے بچیں، اپنے کارناموں کو گنانے اور فخر کے ساتھ ان کا مظاہرہ کرنے اور لوگوں کی توجہات اپنی طرف کھینچنے کی ذرّہ برابر کوشش نہ کریں، بلکہ جو کچھ کریں، اس نیّت اور اس یقین و اطمینان کے ساتھ کریں کہ اُن کا سارا عمل خدا کے لیے ہے اور خدا بہر حال ان کی خدمات سے بھی واقف ہے اور ان کی خدمات کی قدر بھی اسی کے ہاں ہونی ہے خواہ خلق اس سے واقف ہو یا نہ ہو، اور خلق کی طرف سے سزا ملے یا جزاء۔ یہ طریقِ کار غیر معمولی صبر اور حلم اور لگاتار محنت چاہتا ہے۔ اس میں ایک مدتِ

دراز تک مسلسل کام کرنے کے بعد بھی شاندار نتائج کی وہ ہری بھری فصل لہلہاتی نظر نہیں آتی جو سطحی اور نمائشی کام شروع کرتے ہی دوسرے دن سے تماشائیوں اور مداریوں کا دل لبھانا شروع کر دیتی ہے، اس میں ایک طرف اس شخص کے اندر وہ گہری بصیرت، وہ سنجیدگی، وہ پختہ کاری اور وہ معاملہ فہمی پیدا ہوتی ہے جو اس تحریک کے زیادہ صبر آزما اور زیادہ محنت و حکمت چاہنے والے مراحل میں درکار ہونے والی ہے، اور دوسری طرف اس سے تحریک اگرچہ آہستہ رفتار سے چلتی ہے مگر اس کا ایک ایک قدم مستحکم ہوتا چلا جاتا ہے۔ صرف ایسے ہی طریقِ تبلیغ سے سوسائٹی کا مکھن نکال کر تحریک میں جذب کیا جا سکتا ہے۔ اوچھے اور سطحی لوگوں کی بھیڑ جمع کرنے کے بجائے اس طریقِ تبلیغ سے سوسائٹی کے صالح ترین عناصر تحریک کی طرف کھنچتے ہیں اور وہ سنجیدہ Serious کارکن تحریک کو میسّر آتے ہیں جن میں سے ایک ایک آدمی کی شرکت بوالفضولوں کے انبوہ سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔

ہمارے طریقِ کار کا ایک بڑا اہم جزء یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو نظامِ باطل کی قانونی اور عدالتی حفاظت سے خود بخود محروم کر لیا ہے اور علی الاعلان دنیا کو بتا دیا ہے کہ ہم اپنے انسانی حقوق، اپنے مال و جان اور عزّت و آبرو کسی چیز کی عصمت بھی قائم رکھنے کے لیے اس نظام کی مدد حاصل کرنا نہیں چاہتے جس کو ہم باطل سمجھتے ہیں۔ لیکن اس چیز کو ہم نے لازم نہیں کیا ہے بلکہ ان کے سامنے ایک بلند معیار رکھ دینے کے بعد ان کو اختیار دے دیا ہے کہ چاہیں تو اس معیار کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ جائیں ورنہ حالات

کی مجبوریوں سے شکست کھا کھا کر جس قدر پستی میں گرنا چاہیں گرتے چلے جائیں۔ البتہ پستی کی ایک حد ہم نے مقرر کر دی ہے کہ اس سے گر جانے والے کے لیے ہمارے یہاں کوئی جگہ نہیں۔ یعنی ایسا شخص جو جھوٹا مقدمہ بنائے، یا جھوٹی شہادت دے، یا ایسی مقدمہ بازی میں اُلجھے جس کے لیے کسی مجبوری کا عذر نہ پیش کیا جا سکے بلکہ وہ سراسر منفعت طلبی یا نفسانیت کی تسکین یا دوستی اور رشتہ داری کی عصبیت ہی پر مبنی ہو۔

بظاہر لوگ ہمارے اس طریق کار کی حکمتوں کو جو ہم نے قانون و عدالت کے معاملے میں اختیار کیا ہے پوری طرح نہیں سمجھتے اس لیے وہ طرح طرح کے سوالات ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مگر فی الحقیقت اس کے بے شمار فائدے ہیں۔ اس کا اوّلین فائدہ یہ ہے کہ ہم اپنا با اُصول ہونا اپنے عمل سے اور ایسے عمل سے ثابت کر دیتے ہیں جو محض تفریحی نوعیت ہی نہیں رکھتا بلکہ صریح طور پر نہایت تلخ اور انتہائی کڑی آزمائشیں اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی کو انسانی زندگی کے لیے قانون بنانے کا حق نہیں ہے، اور جب ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ حاکمیت Sovereignty صرف خدا کا حق ہے اور خدا کی اطاعت اور اس کے قانون کی پابندی کے بغیر کوئی زمین میں حکم چلانے کا مجاز نہیں ہے، اور جب ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ جو قانونِ الٰہی کی سند کے بغیر معاملاتِ انسانی کا فیصلہ کرے وہ کافر

اور فاسق اور ظالم ہے تو ہمارے اس عقیدے اور ہمارے اس دعویٰ سے خود بخود یہ بات لازم آجاتی ہے کہ ہم اپنے حقوق کی بنیاد کسی غیر الٰہی قانون پر نہ رکھیں اور حق اور غیر حق کا فیصلہ کسی ایسے حاکم کی حکومت پر نہ چھوڑیں۔ جس کو ہم باطل سمجھتے ہیں اپنے عقیدے کے اس تقاضے کو اگر ہم سخت سے سخت نقصانات اور انتہائی خطرات کے مقابلے میں بھی پورا کر کے دکھا دیں تو یہ ہماری راستی اور ہماری مضبوط سیرت اور ہمارے عقیدے اور عمل کی مطابقت کا ایسا بیّن ثبوت ہوگا جس سے بڑھ کر کسی دوسرے ثبوت کی حاجت نہیں رہتی۔ اور اگر کسی نفع کی امید یا کسی نقصان کا خطرہ یا کسی ظلم و ستم کی چوٹ ہم کو مجبور کر دے کہ ہم اپنے عقیدے کے خلاف کام کر گزریں تو یہ ہماری کمزوری کا اور ہماری سیرۃ کے بودے پن کا ایک نمایاں ترین ثبوت ہوگا۔ جس کے بعد کسی دوسرے ثبوت کی ضرورت نہ رہے گی۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ افراد کی پختگی اور ان کے قابلِ اعتماد یا ناقابلِ اعتماد ہونے کا اندازہ کرنے کے لیے ہمارے پاس یہ ایک ایسی کسوٹی ہوگی جس سے ہم بآسانی یہ معلوم کرتے رہیں گے کہ ہم میں سے کون لوگ کتنے پختہ ہیں اور کس سے کس قسم کی آزمائشوں میں ثابت قدم رہنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

اس کا تیسرا اور عظیم الشان فائدہ یہ ہے کہ ایسے افراد یہ مسلک اختیار کرنے کے بعد آپ سے آپ اس بات پر مجبور ہو جائیں گے کہ سوسائٹی

کے ساتھ اپنے تعلّقات کو قانون کی بُنیادوں پر قائم کرنے کے بجائے اخلاق کی بنیادوں پر قائم کریں۔ ان کو اپنا اخلاقی معیار اتنا بلند کرنا پڑے گا، اپنے آپ کو اپنے ماحول میں اس قدر راست باز، اتنا متدیّن، اتنا خدا ترس اور اس قدر خیر مجسّم بنانا پڑے گا کہ لوگ خود بخود ان کے حقوق، ان کی عزّت اور ان کی جان و مال کا احترام کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ کیونکہ اس اخلاقی تحفّظ کے سوا ان کے لیے دنیا میں اور کوئی تحفّظ نہ ہو گا اور قانونی تحفّظ سے محروم ہونے اور پھر اخلاقی تحفظ بھی حاصل نہ کرنے کی صورت میں ان کی حیثیّت دنیا میں بالکل ایسی ہو کر رہ جائے گی جیسے جنگل میں ایک بکری بھیڑیوں کے درمیان رہتی ہو۔

اس کا چوتھا فائدہ یہ ہے اور یہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ ہم اس طرح اپنے آپ کو اور اپنے مفاد اور حقوق کو خطرے میں ڈال کر موجودہ سوسائٹی کی اخلاقی حالت کو بالکل برہنہ کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیں گے۔ جب لوگ یہ جاننے کے بعد کہ ہم پولیس اور عدالت سے اپنی حفاظت کے لیے کوئی مدد لینے والے نہیں ہیں۔ ہمارے حقوق پر علی الاعلان ڈاکے ماریں گے تو یہ اس بات کا نمایاں ترین ثبوت ہو گا کہ ہمارے ملک کی اور ہماری سوسائٹی کی اخلاقی حالت کس قدر کھوکھلی ہے۔ کتنے آدمی ہیں جو صرف اس وجہ سے شریف بنے ہوئے ہیں کہ قانون نے ان کو شریف بنا رہنے پر مجبور کر رکھا ہے، کتنے آدمی ہیں جو ہر قسم کی خیانت اور بے ایمانی کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کو اطمینان ہو جائے کہ دنیا میں

کوئی ان پر گرفت کرنے والا نہیں ہے، کتنے آدمی ہیں جنہوں نے مذہب اور اخلاق اور انسانیت کے جھوٹے لبادے اوڑھ رکھے ہیں حالانکہ اگر موقع میسّر آجائے اور کوئی رکاوٹ موجود نہ ہو تو ان سے بدترین اخلاقی گراوٹ اور لامذہبیت اور حیوانیت کا صدور نہایت آسانی سے ہو سکتا ہے۔ یہ اخلاقی ناسور جو چھپا ہوا ہے اور اندر ہی اندر ہماری قومی سیرت کو گلا اور سڑا رہا ہے۔ ہم اس کو علی رؤس الاشہاد بے پردہ کر کے رکھ دیں گے تاکہ ہمارے ملک کا اجتماعی ضمیر چونک پڑے اور اسے ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو کہ جس مرض سے وہ اب تک غفلت برت رہا ہے وہ کتنی دور پہنچ چکا ہے۔

صاحبو! اپنی دعوت اور اپنے طریق کار کی یہ مختصر تشریح میں نے آپ کے سامنے پیش کر دی ہے۔ اس کو جانچیں اور پرکھیں اور اس پر کڑی سے کڑی تنقید کریں اور دیکھیں کہ ہم کس چیز کی طرف بُلا رہے ہیں، اور بُلانے کے لیے ہم نے جو ڈھنگ اختیار کیا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے، کس حد تک خدا اور رسولؐ کی تعلیمات کے مطابق ہے، کس حد تک موجودہ انفرادی و اجتماعی امراض کا صحیح علاج ہے، اور کس حد تک اس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ ہم اپنے آخری مقصود یعنی کلمۃ اللہ کے بلند اور کلماتِ باطلہ کے پست ہو جانے کو حاصل کر سکتے ہیں۔ اب میں ان شبہات و اعتراضات پر کچھ عرض کروں گا جو اس موقع کے دوران میں بعض ..... احباب کے ذریعے سے مجھ تک پہنچائے گئے ہیں۔

عُلماء اور مَشائخ کی آڑ

ایک اعتراض جو پہلے بھی بار بار سُن چکا ہوں اور آج بھی وہ میرے پاس تحریری شکل میں آیا ہے یہ ہے کہ ایسے بڑے بڑے علماء اور پیشوایانِ دین (جن کے کچھ نام بھی گنائے گئے ہیں) کیا دین سے اس قدر ناواقف تھے کہ نہ صرف یہ کہ خود انہوں نے دین کے اُن تقاضوں کو جو تم بیان کرتے ہو نہیں سمجھا اور پُورا کرنے کی طرف توجّہ نہیں کی، بلکہ تمہارے بیان کرنے کے بعد بھی انہوں نے اسے تسلیم نہیں کیا اور نہ تمہارے ساتھ تعاون کرنا قبول کیا؟ کیا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ سب دین سے ناواقف ہیں؟ یا اس بات کا کہ تم نے خود دین کے نام سے ایک ایسی چیز پیش کی ہے جو مقتضیاتِ دین میں سے نہیں ہے؟ اس سوال کا بہت مختصر جواب میرے پاس یہ ہے کہ میں نے دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے ہمیشہ قرآن اور سنّت ہی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے مَیں کبھی یہ معلوم کرنے کے لیے کہ خدا کا دین مجھ سے اور ہر مومن سے کیا چاہتا ہے، یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ فلاں اور فلاں بزرگ کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں، بلکہ صرف یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ قرآن کیا کہتا ہے اور رسولؐ نے کیا کہا؟ اسی ذریعہ معلومات کی طرف مَیں آپ لوگوں کو بھی توجّہ دلانا چاہتا ہوں۔ آپ یہ دیکھیے کہ جس چیز کی طرف میں آپ کو دعوت دے رہا ہوں، اور جو طریقِ کار اس کے لیے پیش کر رہا ہوں،

آیا قرآن کی دعوت وہی ہے، اور انبیاء علیہم السّلام کا طریقِ کار وہی رہا ہے یا نہیں، اگر قرآن و سنّت سے یہ بات ثابت ہو جائے اور آپ کے نزدیک قرآن و سنّت ہی اصل ذریعۂ ہدایت ہوں تو میری بات مانئے اور میرے ساتھ آجائیے۔ اور اگر اس دعوت اور طریقِ کار میں کوئی چیز قرآن و سنّت سے ہٹی ہوئی ہو تو بے تکلّف اسے ظاہر کر دیجئے۔ جس وقت مجھ پر اور میرے رفقاء پر یہ منکشف ہو جائے گا کہ ہم کہیں بال بھر بھی قرآن اور سنّت سے ہٹے ہوئے ہیں تو آپ انشاء اللہ دیکھ لیں گے کہ ہم حق کی طرف رجوع کرنے میں ایک لمحے کے لیے بھی تامّل کرنے والے نہیں ہیں۔ لیکن اگر آپ حق و باطل کا فیصلہ خدائی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنّت کی بجائے اشخاص پر رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو پُورا اختیار ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے مستقبل کو اشخاص ہی کے حوالے کر دیجئے اور خدا کے ہاں بھی یہی جواب دیجئے گا کہ ہم نے اپنا دین تیری کتاب اور تیرے رسولؐ کی سنّت کے بجائے فلاں اور فلاں لوگوں کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ جواب دہی اگر آپ کو خدا کے ہاں بچا سکتی ہے تو اسی پر اطمینان سے کام کرتے رہیے۔

زہد کا طعنہ

ایک اور اعتراض جس کے متعلق مجھے لکھا گیا ہے کہ ایک مخلص ہمدرد نے اسے پیش کیا ہے یہ ہے کہ "آپ کا یہ طریقِ کار چند زہّاد اور تارکینِ دنیا کی ایک جماعت کیلئے موزوں ہے جو دنیا کے معاملات سے بے تعلّق ہو کر ایک

طرف بیٹھ گئی ہو اور جسے سیاسیاتِ حاضرہ سے کوئی بحث نہ ہو ،
درآں حالیکہ مسلمانوں کو حالات نے مجبور کر دیا ہے کہ بغیر ایک لمحہ ضائع
کیے اِن مسائلِ سیاسی کو حل کریں جن کے حل پر پوری قوم کے مستقبل کا
انحصار ہے ، اور صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی مجبور ہیں کہ سب سے
پہلے اپنے ملک کے سیاسی مستقبل کی فکر کریں۔ کیونکہ اسی پر ان کی فلاح
کا مدار ہے۔ لہذا اس ملک میں جو لوگ بھی زندگی کے عملی مسائل سے دلچسپی
اور تعلّق رکھتے ہیں وہ تو تمہاری طرف توجّہ نہیں کر سکتے۔ البتہ کچھ گوشہ
نشیں و زاویہ پسند لوگ جو مذہبی ذہنیّت رکھتے ہوں تمہیں ضرور مل
جائیں گے۔"

یہ اعتراض دراصل اس سطح بینی کا نتیجہ ہے جس سے ہمارے آج
کل کے سیاست کار حضرات معاملات کو دیکھنے اور سمجھنے میں کام لے رہے
ہیں۔ یہ لوگ محض سیاسی اشکال اور صورتوں کے ردّ و بدل کو دیکھتے ہیں اور
انہی میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں۔ لیکن سیاست کی عمارت
جن بُنیادوں پر قائم ہوتی ہے ان تک ان کی نگاہ نہیں پہنچتی۔ آپ کے
موجودہ سیاسی مسائل جن کی فکر میں آپ لوگ آج کل اُلجھے ہوئے ہیں،
کس چیز کے پیدا کردہ ہیں؟ صرف اس چیز کے کہ جن اخلاقی اور اعتقادی
و فکری اور تہذیبی و تمدّنی بنیادوں پر اس ملک کی سوسائٹی قائم تھی وہ
اتنی کمزور ثابت ہوئیں کہ ایک دوسری قوم اگرچہ وہ نہایت ہی گمراہ
اور نہایت ہی غلط کار تھی مگر بہرحال اپنے اخلاقی اوصاف، اپنی تہذیبی و

تمدّنی طاقت اور اپنی عملی قابلیتوں کے لحاظ سے وہ آپ سے اتنی زیادہ برتر ثابت ہوئی کہ ہزاروں میل دُور سے آکر اس نے آپ کو اپنا محکوم بنالیا۔ پھر آپ اپنی مدّت ہائے دراز کی غفلتوں اور کمزوریوں کی وجہ سے اس حد تک گِرے کہ خود اس محکومی کے اندر بھی آپ کی ہمسایہ قومیں آپ کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہو گئیں اور آپ کے لیے یہ سوال پیدا ہو گیا کہ اپنے آپ کو پہلے کس سے بچائیں۔ گھر والے سے یا باہر والے سے؟ یہ ہے آپ کے تمام موجودہ سیاسی مسائل کا خلاصہ، اور ان مسائل کو آپ بھی اور آپ کی ہمسایہ دوسری ہندوستانی قومیں بھی صرف اس طرح حل کرنا چاہتی ہیں کہ ملک کا سیاسی نظام جس شکل پر قائم ہے اس میں بس کچھ اوپری ردّو بدل ہو جائے۔ میں اس سیاست کو اور اس سیاسی طریقِ کار کو بالکل مہمل سمجھتا ہوں اور اس میں اپنا وقت ضائع کرنے کا کچھ حاصل نہیں پاتا۔ پھر صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں جو سیاسی مسائل اس وقت درپیش ہیں اُن کا خلاصہ بھی میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ انسان کو جو حیثیّت دنیا میں فی الواقع حاصل نہیں تھی اسے خواہ مخواہ اپنی حیثیّت بنا لینے پر اس نے اصرار کیا اور اپنے اخلاق، اپنی تہذیب، اپنے تمدّن، اپنی معیشت اور اپنی سیاست کی بنیاد خدا سے خود مختاری پر رکھ دی جس کا انجام آج ایک عظیم الشان فساد اور ایک زبردست طوفانِ فسق و فجور کی شکل میں رونما ہو رہا ہے۔ اس انجام کو انتظامِ دنیا کی محض ظاہری شکلوں کے ردّو بدل سے دُور

کرنے کے لیے جو کوششیں آج کی جارہی ہیں، انہی کا نام آج "سیاست" ہے، اور میرے نزدیک بلکہ فی الحقیقت اسلام کے نزدیک یہ ساری سیاست سراسر لغو ہے اور بے حاصل ہے۔ مَیں نے اسلام سے جن حقیقتوں کو سمجھا ہے، اُن کی بنا پر میرے نزدیک ہندوستان کے مسلمانوں کی اور ہندوستان کے سارے باشندوں کی اور دنیائے مسلمین اور دنیائے غیر مسلمین کی سیاست کا حل صرف یہ ہے کہ ہم سب خدا کی بندگی اختیار کریں، اس کے قانون کو اپنا قانونِ حیات تسلیم کریں اور انتظامِ دنیا کی زمامِ اختیار فساق و فجار کے بجائے عباد اللہ الصالحین کے ہاتھ میں ہو۔ یہ سیاست اگر آپ کو اپیل نہیں کرتی اور آپ کچھ دوسری سیاست بازیوں سے اپنے مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کا راستہ الگ ہے اور میرا راستہ الگ۔ جایئے اور جن جن طریقوں سے اپنے مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں حل کر کے دیکھ لیجیے۔ مگر مَیں اور میرے رفقاء علیٰ وجہ البصیرت جس چیز میں اپنی، اپنی قوم کی، اپنے ملک کی اور ساری دنیا کی فلاح دیکھتے ہیں، اسی پر ہم اپنی ساری کوششیں صَرف کرتے رہیں گے۔ اگر دنیا کے لوگ ہماری باتوں کی طرف توجّہ کریں گے تو ان کے اپنے لیے بھلا ہے اور نہ کریں گے تو اپنا کچھ بگاڑیں گے ہمارا کچھ نقصان نہ کریں گے۔

رہی یہ غلط فہمی کہ ہم زاہدوں اور گوشہ نشینوں کا ایک گروہ بنا رہے ہیں تو اگر یہ عمداً واقعہ کی غلط تعبیر نہیں ہے اور واقعی غلط فہمی ہی ہے تو اِسے ہم صاف صاف رفع کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم دراصل ایک ایسا گروہ تیار کرنا چاہتے ہیں جو ایک طرف زہد و تقویٰ

میں اصطلاحی زاہدوں اور متقیوں سے بڑھ کر ہو، اور دوسری طرف دنیا کے انتظام کو چلانے کی قابلیت وصلاحیت بھی عام دنیا داروں سے زیادہ اور بہتر رکھتا ہو۔ ہمارے نزدیک دنیا کی تمام خرابیوں کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ لوگ نیکی کے صحیح مفہوم سے ناآشنا ہونے کی بنا پر گوشہ گیر ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور پرہیزگاری اس کو سمجھتے ہیں کہ دنیا کے معاملات ہی سے پرہیز کریں، اور دوسری طرف ساری دنیا کے کاروبار بدوں کے ہاتھ میں آجاتے ہیں جن کی زبان پر نیکی کا کام اگر کبھی آتا بھی ہے تو صرف خلقِ خدا کو دھوکہ دینے کے لیے۔ اس خرابی کا علاج صرف یہی ہو سکتا ہے کہ صالحین کی ایک جماعت منظم کی جائے جو خدا ترس بھی ہو، راست باز اور دیانت دار بھی ہو، خدا کے پسندیدہ اخلاق واوصاف سے آراستہ بھی ہو اور اس کے ساتھ دنیا کے معاملات کو دنیا داروں سے زیادہ اچھی طرح سمجھے اور خود دنیا داری ہی میں اپنی مہارت وقابلیت سے ان کو شکست دے سکے۔ ہمارے نزدیک اس سے بڑا اور کوئی سیاسی کام نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے زیادہ کامیاب سیاسی تحریک اور کوئی ہو سکتی ہے کہ ایسے ایک صالح گروہ کو منظم کر لیا جائے، بداخلاق اور بے اصول لوگوں کے لیے دنیا کی چراگاہ میں بس اسی وقت تک چرنے چگنے کی مہلت ہے جب تک ایسا گروہ تیار نہیں ہو جاتا، اور جب ایسا گروہ تیار ہو جائے گا تو آپ یقین رکھیے کہ نہ صرف آپ کے اس ملک کی بلکہ بتدریج ساری دنیا کی سیاست اور معیشت اور مالیات اور علوم وآداب اور عدل وانصاف کی باگیں اسی گروہ کے ہاتھ آجائیں گی اور فساق وفجار کا

چراغ ان کے آگے نہ جل سکے گا۔ یہ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ یہ انقلاب کس طرح رونما ہوگا۔ لیکن جتنا مجھے کل سُورج کے طلوع ہونے کا یقین ہے اتنا ہی مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ یہ انقلاب بہرحال رونما ہو کر رہے گا۔ بشرطیکہ ہمیں صالحین کے ایسے گروہ کو منظم کرنے میں کامیابی حاصل ہو جائے۔

رفقائے سے خطاب

اب مَیں آپ لوگوں سے اجازت چاہوں گا کہ تھوڑی دیر کے لیے عام خطاب کو چھوڑ کر خاص طور پر کچھ باتیں اپنے رفقاء سے عرض کروں:

رفقاءِ محترم! سب سے پہلے .... مَیں اسی بات کو دُہرانا ضروری سمجھتا ہوں، جسے ہمیشہ اور ہر موقع پر دُہراتا رہا ہوں کہ اپنی اس عظیم الشّان ذمّہ داری کو محسوس کیجیے جس کو آپ نے شعوری طور پر اپنے خدا سے عہد و میثاق مضبوط کر کے اپنے اوپر خود عاید کر لیا ہے۔ آپ کے اس عہد کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ آپ قانونِ الٰہی کے زیادہ سے زیادہ پابند ہوں اور آپ کے عقیدے اور قول و عمل میں کامل مطابقت ہو اور آپ کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہ جائے جس میں آپ کے افکار و اعمال اس اسلام سے مختلف ہوں جس پر آپ ایمان لائے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ آپ کے اسی عہد کا تقاضا اور نہایت شدید تقاضا یہ بھی ہے کہ جس اسلام پر آپ ایمان لائے ہیں اور جسے آپ اپنے

بادشاہ کا دین سمجھتے ہیں اور جسے آپ تمام نوعِ انسانی کے لیے حق جانتے ہیں اور واحد ذریعۂ فلاح بھی سمجھتے ہیں اس کو تمام دوسرے دینوں اور مسلکوں اور نظاموں کے مقابلے میں سربلند کرنے کے لیے اور نوعِ انسانی کو ادیانِ باطلہ کی فساد انگیز تباہ کاریوں سے بچا کر دینِ حق کی سعادتوں سے بہرہ ور کرنے کے لیے آپ میں کم از کم اتنی بے چینی پائی جائے جتنی ادیانِ باطلہ کے پیرو اپنے اپنے جھوٹے اور غارت گر دینوں کی حمایت و برتری کے لیے دکھا رہے ہیں۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے ان لوگوں کی مثالیں موجود ہیں جو سخت سے سخت خطرات، شدید سے شدید نقصانات، جان و مال کے زیان، ملکوں کی تباہی اور اپنی اور اپنی اولاد اور اپنے عزیزوں اور جگر گوشوں کی قربانی صرف اس لیے گوارا کر رہے ہیں کہ جس طریقِ زندگی کو وہ صحیح سمجھتے ہیں اور جس نظام میں اپنے لیے فلاح کا امکان انہیں نظر آتا ہے اسے نہ صرف اپنے ملک پر بلکہ ساری دنیا پر غالب کر کے چھوڑیں۔ ان کے صبر اور ان کی قربانیوں اور محنتوں اور ان کے تحمل مصائب اور اپنے مقصد کے ساتھ ان کے عشق کا موازنہ آپ اپنے عمل سے کر کے دیکھئے اور محسوس کیجئے کہ آپ اس معاملہ میں اُن کے ساتھ کیا نسبت رکھتے ہیں۔ اگر فی الواقع آپ کبھی ان کے مقابلے میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو صرف اسی وقت جبکہ ان حیثیات میں آپ ان سے بڑھ جائیں، ورنہ آپ کے مالی ایثار، آپ کے وقت اور محنت کے ایثار، اور اپنے مقصد کے ساتھ آپ کی محبّت اور اس کے لیے آپ کی قربانی کا جو حال اس وقت ہے اس کو دیکھتے ہوئے تو آپ یہ حق

بھی نہیں رکھتے کہ اپنے دل میں اس تمنّا کو پرورش کریں کہ آپ کے ہاتھوں یہ جھنڈا کبھی بلند ہو۔

دوسری چیز جس کی طرف مجھے آپ کو توجّہ دلانے کی بار بار ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ لوگ دین کے اصُولی اور بُنیادی امور کی اہمیّت کو سمجھیں اور فرُوغ کے ساتھ جو اہتمام اب تک کرتے رہے ہیں اور جس اہتمام کی بیماری آپ کے سارے مذہبی ماحول کو لگی ہوئی ہے اس سے بچنے کی کوشش کریں۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ ..... لوگوں میں ابھی تک ان جزئیات کے ساتھ اچھا خاصہ انہماک بلکہ غلو پایا جاتا ہے جن پر ایک مدّت سے فرقہ بندیاں اور گروہی کشمکشیں ہوتی رہی ہیں، اور یہ کیفیت بسا اوقات اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ہماری تفہیم سے اس طریقے کو چھوڑنے کے بجائے ہمارے بعض احباب اُلٹا ہمیں کو ان بحثوں میں اُلجھانے کی کوشش کرتے ہیں خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جن جزئیات پر آپ لوگ بحثیں کرتے ہیں وہ خواہ کتنی ہی اہمیّت رکھتی ہوں مگر بہرحال یہ وہ چیزیں نہیں ہیں جن کو قائم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو مبعوث کیا ہو اور اپنی کتابوں کو نازل کیا ہو۔ انبیاء کی بعثت اور کتبِ الٰہی کی تنزیل کا مقصد ان جزئیات کو قائم کرنا نہیں ہے بلکہ دینِ حق کو قائم کرنا ہے۔ ان کا اصل مقصد یہ رہا ہے کہ خلقِ خدا اپنے مالکِ حقیقی کے سوا کسی کے تابع فرمان نہ رہے۔ قانون صرف خدا کا قانون ہو، تقویٰ صرف خدا سے ہو، امر صرف خدا کا مانا جائے،

حق اور باطل کا فرق اور زندگی میں راہِ راست کی ہدایت صرف وہی مسلّم ہو جسے خدا نے واضح کیا ہے اور دُنیا میں اُن خرابیوں کا استیصال کیا جائے جو اللہ کو ناپسند ہیں اور ان خیرات و حسنات کو قائم کیا جائے جو اللہ کو محبوب ہیں۔ یہ ہے دین اور اسی کی اقامت ہمارا مقصد ہے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسی کام پر ہم مامور ہیں۔ اس کام کی اہمیّت اگر آپ پوری طرح محسوس کر لیں اور اگر آپ کو اس بات کا بھی احساس ہو کہ اس کام کے معطّل ہو جانے اور باطل نظاموں کے دنیا پر غالب ہو جانے سے دنیا کی موجودہ حالت کس قدر شدّت سے غضبِ الٰہی کی مستحق ہو چکی ہے، اور اگر آپ یہ بھی جان لیں کہ اس حالت میں ہمارے لیے غضبِ الٰہی سے بچنے اور رضائے الٰہی سے سرفراز ہونے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ ہم اپنی تمام قوّت خواہ وہ مال کی ہو یا جان کی، دماغ کی ہو یا زبان کی، صرف اقامتِ دین کی سعی میں صَرف کر دیں تو آپ سے کبھی ان فضول بحثوں اور ان لایعنی افکار کا صُدور نہ ہو سکے جن میں اب تک آپ میں بہت سے لوگ مشغول ہیں۔ میرے نزدیک یہ تمام مشاغل صرف اس ایک چیز کا نتیجہ ہیں کہ لوگوں نے ابھی تک اس بات کو پوری طرح سمجھا نہیں ہے کہ دین حقیقت میں کس چیز کا نام ہے اور اس کے واقعی مطالبات اپنے پیرؤوں سے کیا ہیں۔

ایک اور خامی جو بعض لوگوں میں پائی جاتی ہے اور جو اکثر ہمارے لیے سبب پریشانی بنتی رہتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ حضرات اصُول

اور مقصد اور نظریے کی حد تک تو ہمارے مسلک کو سمجھ گئے ہیں لیکن طریقِ کار کو اچھی طرح نہیں سمجھے۔ اس لیے بار بار ان کی توجہات دوسرے مختلف طریقوں کی طرف پھر جاتی ہیں اور وہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر کے بطور خود ہمارے نصب العین اور دوسروں کے طریقِ کار کی ایک معجون مرکب بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور جب انہیں اس سے روکا جاتا ہے تو وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم خواہ مخواہ چلتے ہوئے زود اثر طریقِ کار کو محض اس تعصّب کی بنا پر اختیار نہیں کرنا چاہتے کہ وہ ہمارا نہیں بلکہ دوسروں کا ایجاد کردہ طریقہ ہے۔ بعض حضرات نے تو ستم ہی کر دیا کہ جب ہماری طرف سے ان کو ٹوکا گیا تو انہوں نے ہمیں یہ اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ نام آپ ہی کا لیا جائے گا دوسروں کا نہ لیا جائے گا۔ گویا ان کے نزدیک ہماری تگ و دو صرف اپنا رجسٹرڈ ٹریڈ مارک چلانے کے لیے ہے، اور لطف یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ اس کام میں شریک ہیں۔ . . . . . .

بعض مقامات پر لوگ اس وبا سے خاص طور پر بہت زیادہ متأثر ہوئے ہیں۔ لیکن جہاں تأثر اتنا زیادہ نہیں ہے وہاں بھی مختلف طریقوں سے اس بات کا اظہار ہوتا رہتا ہے کہ کوئی تیز رفتار طریقِ کار اختیار کر کے جلدی سے کچھ چلتا پھرتا کام دنیا کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ یہ سب "عمل بلا فکر" کی اس پرانی بیماری کے نتائج ہیں جو مسلمانوں میں بہت دنوں سے پرورش پا رہی ہے۔ اور "فکر بلا عمل" سے کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر ان مذہبی اور سیاسی تحریکوں میں سے کسی میں بھی فی الواقع

کوئی جان ہوتی جو اس وقت مسلمانوں میں چل رہی ہیں تو شاید ہم اس تحریک کی ابتداء میں ابھی کچھ تامل سے کام لیتے اور اپنی پوری قوت ان نسخوں کو آزما لینے میں صرف کر دیتے۔ مگر جو تھوڑی بہت نظر و بصیرت اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کی ہے اس کی بنا پر ہم خوب اچھی طرح یہ سمجھ چکے ہیں کہ وقت کی چلتی ہوئی تحریکوں اور ان کی قیادتوں میں سے ایک بھی مسلمانوں کے مرض کا صحیح علاج نہیں ہے، اور نہ اسلام کے اصل منشاء کو پورا کرنے والی ہے۔ محض جزوی طور پر مسلمانوں کے امراض کی ناکافی اور سطحی تشخیص کی گئی ہے اور اسلام کے اصل تقاضوں کا بھی صحیح طور پر ادراک نہیں کیا گیا ہے۔ پھر یہ بھی اچھی طرح نہیں سمجھا گیا کہ کفر و فسق کا یہ غلبہ اور دین کی یہ بے بسی اور مغلوبی جو آج موجود ہے فی الحقیقت کن اسباب کا نتیجہ ہے۔ اور اب اس حالت کو بدلنے کے لیے کس ترتیب و تدریج سے کن کن میدانوں میں کیا کیا کام کرنا ہے۔ ان سب چیزوں کو سوچے اور سمجھے بغیر جو سطحی اور جزئی تحریکیں جاری کی گئیں اور ان کو چلانے کے لیے جو زود اثر اور فی الفور نتیجہ منظرِ عام پر لے آنے والے طریقے اختیار کیے گئے وہ سب ہمارے نزدیک چاہے غلط نہ ہوں، چاہے ان کی مذمت ہم نہ کریں، چاہے ان کی اور ان کے پیچھے کام کرنے والے اخلاص کی ہم دل سے قدر کریں مگر بہرحال ہم ان کو لاحاصل سمجھتے ہیں اور ہمیں پوری طرح یقین ہے کہ اس قسم کی تحریکیں اگر صدیوں تک بھی پوری کامیابی اور ہنگامہ خیزی کے ساتھ چلتی رہیں تب بھی نظامِ زندگی میں کوئی حقیقی انقلاب رونما نہیں ہو سکتا۔ حقیقی انقلاب

اگر کسی تحریک سے رُونما ہو سکتا ہے تو وہ صرف ہماری تحریک ہے اور اس کے لیے فطرتاً یہی ایک طریقِ کار ہے جو ہم نے خوب سوچ سمجھ کر اور اس دین کے مزاج اور اس کی تاریخ کا گہرا جائزہ لے کر اختیار کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارا طریقِ کار نہایت صبر آزما ہے، سُست رفتار ہے، جلدی سے کوئی محسوس نتیجہ اس سے رُونما نہیں ہو سکتا اور اس میں برسوں لگاتار ایسی محنت کرنی پڑتی ہے جس کے اثرات اور جس کی عملی نمود کو بسا اوقات خود محنت کرنے والا بھی محسوس نہیں کر سکتا۔ لیکن اس راہ میں کامیابی کا راستہ یہی ہے اور اس کے سوا کوئی دُوسرا طریقِ کار اس مقصد کے لیے ممکن نہیں ہے۔ جن لوگوں کو ہمارے مسلک اور طریقِ کار یا ان دونوں میں سے کسی ایک پر بھی اطمینان حاصل نہ ہو اُن کے لیے یہ راستہ تو کھُلا ہُوا ہے کہ ہم سے باہر جا کر اپنی صوابدید سے جس طرح چاہیں کام کریں لیکن یہ اختیار کسی طرح نہیں دیا جا سکتا کہ بطورِ خود وہ ان دونوں میں یا ان میں سے کسی ایک چیز میں جو ترمیم چاہیں کر لیں۔ ہمارے ساتھ جس کو چلنا ہے اسے پُورے اطمینان کے ساتھ ہمارے مسلک اور طریقِ کار کو ٹھیک سمجھ کر چلنا چاہیئے اور جو شخص کچھ بھی میلان دُوسری تحریکوں اور جماعتوں کی طرف رکھتا ہو اسے پہلے ان راستوں کو آزما کر دیکھ لینا چاہیے، پھر اگر اس کا ذہن اسی فیصلے پر پہنچے جس پر ہم پہنچے ہوئے ہیں تو وہ اطمینانِ قلب کے ساتھ ہمارے ساتھ آجائے۔

سطحیت اور مظاہرہ پسندی اور جلد بازی کی جو کمزوری مسلمانوں میں

بالعموم پیدا ہو گئی ہے اس کا ایک ثبوت مجھے حال میں یہ ملا ہے کہ عوام میں تعلیم بالغاں کے ذریعے کام کرنے کا جو طریقہ چند ماہ پیشتر مَیں نے پیش کیا تھا اس نے تو بہت کم لوگوں کو اپیل کیا مگر گروہ بنا بنا کر بستیوں میں گشت لگانے اور فوری نتیجہ دکھانے والے طریقِ کار کے لیے (خواہ اس کا اثر کتنا ہی ناپائیدار ہو) مختلف مقامات سے ہمارے احباب کے تقاضے برابر چلے آ رہے ہیں اور کسی فہمائش پر بھی ان کا سلسلہ ٹوٹنے میں نہیں آتا۔ حالانکہ ایک طرف یہ طریقِ کار ہے کہ ایک سال یا اس سے زیادہ مدّت تک ناخواندہ عوام میں سے چند آدمیوں کو پیہم تعلیم و تربیت دے کر خوب پختہ کر لیا جائے اور ان کے عقائد، اخلاق، اعمال، مقصدِ زندگی، معیارِ قدر و قیمت، ہر چیز کو پوری طرح بدل ڈالا جائے اور پھر ان کو ..... مستقل کارکن بنا کر، مزدوروں کسانوں اور دوسرے عامی طبقوں میں کام کرنے کے لیے استعمال کیا جائے، اور دوسری طرف یہ طریقِ کار ہے کہ ایک قلیل مدّت میں ہزارہا آدمیوں کو بیک وقت چند ابتدائی امورِ دین کی حد تک مخاطب کیا جائے اور فوری طور پر ان میں ایک حرکت پیدا کر کے چھوڑ دیا جائے، چاہے دوسرے چکر کے وقت پہلی حرکت کا کوئی اثر ڈھونڈے سے بھی نہ مِل سکے۔ ان دونوں طریقوں میں سے جب مَیں دیکھتا ہوں کہ لوگ پختہ نتائج پیدا کرنے والے دیر طلب اور محنت طلب اور صبر آزما طریقے کو سنتے ہیں اور اس کی طرف کوئی توجّہ نہیں کرتے اور دوسرے طریقے کی طرف بار بار دوڑ چلنے کی کوشش کرتے ہیں تو میرے سامنے مسلمانوں کی وہ کمزوریاں بالکل بے نقاب ہو جاتی

ہیں جن کی وجہ سے اب تک وہ خام کاریوں ہی میں اپنی قوتیں اور محنتیں اور اپنے مال اور اوقات ضائع کرتے رہے ہیں۔ مَیں اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جب تک اس تحریک کی باگیں میرے ہاتھ میں ہیں مَیں اپنے رفقاء کو صحیح اور حقیقی نتیجہ خیز کاموں ہی پر لگانے کی کوشش کروں گا اور بے حاصل کوششوں میں جانتے بُوجھتے ان کو مشغول نہ ہونے دُوں گا۔

اپنی تقریر کو ختم کرنے سے پہلے ایک آخری بات کی طرف مَیں آپ لوگوں کو توجّہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہمارے احباب میں ایک اچھا خاصا گروہ پایا جاتا ہے جس نے تبلیغ و اصلاح کے کام میں تشدّد اور سخت گیری کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ جو سوالات اُن کی طرف سے اکثر میرے پاس آتے رہتے ہیں اُن سے مَیں محسوس کرتا ہوں کہ اُن کے اندر بگڑے ہوئے لوگوں کو سنوارنے کی بیتابی اتنی زیادہ نہیں ہے جتنی انہیں اپنے سے کاٹ پھینکنے کی بیتابی ہے۔ دینی حرارت نے ان میں ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ اتنا نہیں اُبھارا جتنا نفرت اور غصّے کا جذبہ اُبھار دیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اکثر یہ تو پوچھتے ہیں کہ جو لوگ ایسے اور ایسے ہیں ان سے ہم تعلقات کیوں نہ منقطع کر لیں اور ان کے ساتھ نمازیں کیوں پڑھیں اور ان کو کافر و مشرک کیوں نہ کہیں۔ لیکن یہ پُوچھنے کا ان کو بہت کم خیال آتا ہے کہ ہم اپنے ان بھٹکے ہوئے بھائیوں کو سیدھی راہ پر کیسے لائیں، ان کی غفلت و بے خبری کو کس طرح دُور کریں۔ ان کی کج رَوی کو راست روی سے کیسے

بدلیں اور ان کو نورِ ہدایت سے مستفید ہونے پر کیونکر آمادہ کریں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کے فضل سے اور اپنی خوش قسمتی سے حق کو پالیا ہے ان کے اندر اس وجدانِ حق نے شکر کے بجائے کِبر کا جذبہ پیدا کر دیا ہے اور اسی کا اظہار ان شکلوں میں ہو رہا ہے۔ خدا نہ کرے کہ میرا یہ گمان صحیح ہو لیکن مَیں اسے صاف صاف اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ ہمارے رفیقوں میں ہر شخص پوری خدا ترسی کے ساتھ اپنے نفس کا جائزہ لے کر تحقیق کرنے کی کوشش کرے کہ کہیں شیطان نے یہ مرض تو ان کو نہیں لگا دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بگڑی ہوئی سوسائٹی کے درمیان علمِ صحیح اور عملِ صالح رکھنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک وبائے عام میں مبتلا ہو جانے والی بستی کے درمیان چند تندرست لوگ موجود ہوں جو کچھ طب کا علم بھی رکھتے ہوں اور کچھ دواؤں کا ذخیرہ بھی ان کے پاس ہو۔ مجھے بتایئے کہ اُس وبا زدہ بستی میں ایسے چند لوگوں کا حقیقی فرض کیا ہے؟ کیا یہ کہ مریضوں سے اور ان کی لگی ہوئی الائشوں سے نفرت کریں یا انہیں اپنے سے دُور بھگائیں اور انہیں چھوڑ کر نکل جانے کی کوشش کریں یا یہ کہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر ان کا علاج اور ان کی تیمارداری کرنے کی فکر کریں اور اس سعی میں اگر کچھ نجاستیں ان کے جسم و لباس کو لگ بھی جائیں تو انہیں برداشت کر لیں۔ شاید میں پورے وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اگر یہ لوگ پہلی صورت اختیار کریں تو خدا کے ہاں اُلٹے مجرم قرار پائیں گے۔ اور ان کی اپنی تندرستی اور ان کا علمِ طب سے واقف ہونا اور ان

کے پاس دواؤں کا ذخیرہ موجود ہونا نافع ہونے کے بجائے اُلٹا ان کے جرم کو اور زیادہ سخت بنا دے گا۔ اسی پر آپ قیاس کر لیں کہ جن لوگوں کو دینی تندرستی حاصل ہے اور جو دین کا علم اور اصلاح کے ذرائع بھی رکھتے ہیں۔ ان کے لیے کونسا طریقہ رضائے الٰہی کے مطابق ہے۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ط

دعوتِ اسلامی

اور

اُسکی کامیابی کے اصُول

از

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

"اگر ہم نے اس جدوجہد میں بازی پالی تو فہوالمراد، اور اگر دوسری بات ہوئی تب بھی تمام راستوں میں ایک حق ہی کا راستہ ایسا ہے جس میں ناکامیابی کا کوئی سوال نہیں۔ اس میں اوّل قدم بھی منزل ہے اور آخر بھی! ناکامی کا اس کوچہ میں گذر نہیں ہے۔ اس کو مان لینے اور اس پر چلنے کا عزم راسخ کر لینے کی ضرورت ہے۔ پھر اگر تیز سواری مِل گئی تو فبہا! یہ نہ سہی تو چھکڑے مِل جائیں گے انہی سے سفر ہوگا۔ یہ بھی نہیں تو دو پاؤں موجود ہیں ان سے چلیں گے! پاؤں بھی نہ رہے تو آنکھیں تو ہیں، ان سے نشان منزل دیکھیں گے! آنکھیں بھی بے نور ہو جائیں تو دل کی آنکھ تو ہے جس کی بصارت کو کوئی سلب نہیں کر سکتا بشرطیکہ ایمان موجود ہو۔"

اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ
لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ط

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی
سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ ط

حاضرین! میں یہاں مسلسل مشغولیت اور انہماک کی وجہ سے اب اتنا تھک چکا ہوں کہ اس وقت کوئی اچھی خدمت سرانجام نہیں دے سکتا۔ لیکن موقع مل جانے کے بعد فرصت کی ناقدری ہوگی اگرچند اور ضروری باتیں آپ کے کانوں تک نہ پہنچا دوں۔ ان کے پہنچانے کا مقصد ایک تو یہ ہے کہ آپ خود غور فرمائیں، اور دوسرا یہ کہ اگر آپ اس سے متفق ہوں تو ان کو دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ مَیں اس وقت تحریکِ اسلامی کی نسبت چند حرف کہوں گا، اور یہ امر واضح کروں گا کہ یہ تحریک کن اساسات پر قائم ہے۔ مَیں اس تحریک سے تعلق رکھتا ہوں اور مَیں نے اس بنیاد پر اس کا تعلق قبول کیا ہے کہ مَیں نے پُورے یقین کے ساتھ جہاں تک میری علمی بصیرت ہے، محسوس کیا ہے کہ یہ چند ایسے مسلّم اساسات پر قائم ہے جن کے بارے میں مسلمانوں کی رائیں دو نہیں ہیں۔ ہم سب کا ان پر اتفاق ہے ان چیزوں میں سے کسی چیز کے بارے میں بھی مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

آپ کو خوب معلوم ہے کہ ہم کو اور آپ کو اسلام سے جو نسبت حاصل ہے وہ اس رشتے کی بنا پر ہے جو ہمارا اللہ اور اس کے آخری رسولؐ سے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو احکام اور قوانین دیئے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کی دنیا کو دعوت دی ہے اس کا تعلق ہے جس کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو مسلم اور مسلمان کہتے ہیں۔ اگر ان چیزوں میں سے کسی چیز کے ساتھ ہمارا رشتہ ضعیف ہو جائے تو اسلام کے ساتھ ہماری نسبت بھی ضعیف ہو جائے گی، اور اگر منقطع ہو جائے تو اسلام سے ہمارا رشتہ بھی منقطع ہو جائے گا۔ اس زنجیر کے ٹوٹنے کے بعد دنیا کے کارخانوں کی بنی ہوئی کتنی ہی سنہری اور روپہلی زنجیریں لائی جائیں۔ لیکن اسلام کے ساتھ ہمارا رشتہ کسی طرح بندھ نہیں سکتا۔ آج کل قوموں اور جماعتوں کی اجتماعی شیرازہ بندی میں جن چیزوں کو اصلی دخل ہے وہ قومیت اور وطنیت ہے، ملک کا اشتراک ہے، نسل ہے، خون ہے، رنگ ہے، جن لوگوں نے تمدنی مسائل پر غور کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ انہی اساسات پر حلقے بنتے ہیں، قومیں بنتی ہیں، تہذیب کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں۔ ایک انگریز کی انگریزیت، ایک جرمن کی جرمنیت، اور ایک جاپانی کی جاپانیت، اس کے نسب، نسل اور ملک کی بنا پر قائم ہے۔ لیکن ایک مسلمان خواہ وہ کتنا ہی عجمی ہو (حالانکہ مسلمان کبھی عجمی نہیں ہوتا) کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ یہ چیزیں اسلامی اجتماعیت کی تشکیل میں بھی چونے اور گارے کا کام دے سکتی ہیں۔ اسے خوب معلوم ہے کہ مسلمان کا اسلام سے رشتہ اللہ اور اس کے رسول سے تعلق کی بنیاد پر قائم

ہے اور یہی اللہ اور اس کے رسُول کا رشتہ ایک مسلمان کو مسلمان سے جوڑتا ہے۔ جو اللہ اور اس کے رسُول سے اپنا رشتہ کاٹ لے وہ اسلام سے منقطع ہو گیا، اور جس نے اسلام سے علیٰحدگی اختیار کر لی اس نے اسلامی ہیئت اجتماعیہ میں اپنی جگہ کھو دی۔ آپ کی اِن سڑکوں پر چلتا پھرتا ایک معمولی چمار جس کو پشتہا پشت سے اسلام سے کوئی نسبت حاصل نہ رہی ہو، اگر ابھی ان اساسات کا اقرار کرے جن کی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہے تو وہ معًا اسلام میں داخل ہو جائے گا اور آپ کی مسجد میں حقدار ہو گا کہ اگلی صفوں میں جگہ پائے۔ لیکن ایک شخص جس کا خاندان پشت ہا پشت سے مسلمان ہے اور شیخ الاسلامی کے عہدے پر متمکن چلا آیا ہے اس کا کوئی نا خلف فرزند اگر اصُولِ اسلام میں سے ایک اصل کا بھی انکار کرتا ہے تو کوئی نہیں ہے جو اُسے ہماری صفِ پائیں میں بھی جگہ دِلا سکے۔ اگرچہ اس کے خاندان کو خاندانِ رسالت ہی سے نسبت کیوں نہ حاصل ہو۔ نسل، نسب، خاندان اور وطن اسلامی تصوّر میں بالکل بے معنیٰ ہیں۔

اسلام کے اساسی معتقدات اور ان کا مفہوم

اب آیئے غور کیجیے کہ اسلام جس کی نسبت ہی سے ہماری تمام کائنات ہے۔ اس کے وہ اساسی معتقدات کیا ہیں جن پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اور جن کو صدقِ دل سے مانے بغیر نہ آدمی اسلام میں داخل ہوتا ہے اور نہ اُن پر قائم رہے بغیر اسلام پر قائم رہتا ہے۔

آپ کو خوب معلوم ہے کہ پہلی چیز ایمان باللہ ہے۔ لیکن ایمان باللہ کا مطلب صرف زبان سے اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کہہ دینا نہیں ہے۔ اتنے کا اقرار تو ابوجہل اور ابولہب کو بھی تھا۔ پس یہاں تک آپ ان سے کچھ آگے نہیں ہیں۔ بلکہ اس حد تک دنیا کے اکثر افراد آپ کے برابر ہیں۔ دنیا کی پچھلی تاریخ خدا کے افکارِ مطلق سے بالکل خالی ہے۔ دنیا کو ہمیشہ خدا کا اقرار رہا ہے۔ یہ صرف موجودہ عہدِ روشن کی خصوصیات میں سے ہے کہ اس میں کچھ ایسے بے بصیرت بھی پیدا ہو رہے ہیں جو خدا کے منکر ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ اللہ پر ایمان لانے کا مفہوم صرف یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اقرار کی حد تک اللہ کا اقرار کر لیں۔

ایمان باللہ

بلکہ ایمان باللہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ پر، اس کی تمام صفات و اسمائے حسنیٰ کے ساتھ جو شانِ الوہیت کے لیے موزوں ہیں اور جن کی انبیاء علیہم السّلام نے تعلیم دی ہے، ایمان لایا جائے۔ یعنی یہ کہ ہم اس کے بندے ہیں، غلام ہیں، ہماری مرضی اور ہماری خواہش اس کے حکم کے آگے کچھ نہیں، صرف وہی حاکم علی الاطلاق ہے۔ خالق و مالک وہی ہے۔ قانون دینے والا، شریعت بنانے والا وہی ہے۔ نفع و ضرر پہنچانے والا اور مُدبّرِ کل وہی ہے، ان صفات کا مستحق اور کوئی نہیں، اگر اس کی صفات میں سے کسی صفت میں دُوسرے کی حصّہ داری مان لی جائے یا خدا کے اختیارات میں کسی کو شریک کر دیا جائے تو تمام ایمان ہی غارت ہو جائے، اس میں کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہے۔

پھر ہم خدا کے متعلق یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ ہم کو پیدا کر کے اس نے ہمیں اندھے بھینسے کی طرح چھوڑ دیا ہے کہ جدھر چاہیں بھٹکتے پھریں یا یہ کہ وہ ہندوؤں کے مہادیو کی طرح محض ڈنڈوت کر لینے سے راضی ہو جاتا ہے بلکہ خدائے تعالیٰ نے جس طرح ہماری مادی زندگی کے اسباب فراہم کیے ہیں ٹھیک اسی طرح اس نے ہماری ہدایت کے لیے انبیاء و رسل بھیجے ہیں۔ اور جس طرح اس نے اپنی پرستش کا مطالبہ کیا ہے اسی طرح اس نے اپنی اطاعت کا بھی مطالبہ کیا ہے۔ صرف یہ چیز کافی نہیں ہے کہ ہم زبان سے اس کی تعریف کر دیں یا صرف پانچ وقت نمازیں پڑھ لیں، بلکہ اس کی فرمانبرداری و اطاعت بھی لازمی ہے۔ اور یہ اطاعت زندگی کے کسی ایک ہی گوشے میں نہیں ہے بلکہ ہر گوشے میں ہے۔ مسلمان صرف مسجد کے اندر ہی اللہ کا بندہ نہیں ہوتا بلکہ اسے ہر جگہ اللہ کے قانون اور اس کے احکام کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ ہندو اور غیر مسلم کا دین، صرف مندر اور معبد میں اس سے چپک جاتا ہے۔ لیکن مسلمان کا دین ہر وقت اس کے ساتھ ہے۔ مسجد میں، گھر میں، بازار میں، دکان میں، کھیتی باڑی میں، لین دین میں، سیاست میں، حکومت میں، معیشت میں اور تہذیب و تمدن میں، غرض کوئی جگہ نہیں ہے جہاں خدا کا دین سانس کی طرح مسلمان کے ساتھ نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی یہ اطاعت اس کے انبیاء کی اطاعت کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ جس طرح اللہ کو ماننے کا مطلب محض "اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ" کہنا نہیں ہے بلکہ اللہ کو شارع، مالک، قانون ساز،

مدبّر مانتا ہے اسی طرح رسول کو ماننے کا مطلب محض یہ نہیں ہے کہ ہم اُس کے رسول ہونے کا اقرار کر لیں، اگر ہم صرف اقرار کی حد تک رسُول کو مانتے ہیں تو مدینہ کے منافقین اس معاملہ میں ہم سے پیچھے نہ تھے۔ وہ اللہ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ مگر اللہ نے انہیں صادق القول تسلیم نہیں کیا بلکہ فرمایا وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں۔ آپ اللہ کے رسول ہیں، مگر یہ اپنے قول کے سچّے نہیں ہیں۔

ایمان بالرسالت

کیونکہ رسول کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اسے واجب الاطاعت مانیں، زندگی کے ہر گوشے میں خدا کے نائب اور رسُول ہونے کی حیثیّت سے اس کی رہبری تسلیم کریں، اس کے خلاف جو کچھ ہے اُسے غیر فطری اور خدا سے انحراف یقین کریں اور اس سے فطری دشمنی رکھیں اور جو اس کے مطابق ہے اس سے فطری محبّت ہو۔ "وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ۔ ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔" رسول کی رسالت کے اقرار کا حق اس سے نہیں ادا ہو جاتا کہ اس کا نام آتے ہی اُنگلیوں کو چُوم کر آنکھوں سے لگا لیں، یا میلاد کی مجلسیں قائم کر دیں، یا رسُول کے نام پر جھنڈا لے کر سڑکوں اور گلیوں کا طواف کرتے پھریں، رسول درحقیقت واجب الاطاعت بن کر آتا ہے، کسی شعبے میں اس کے سوا کسی اور کی اطاعت کو اپنی رضا سے تسلیم کرنا اللہ

اور اس کے رسول سب کا انکار ہے۔ زندگی کے ہر مرحلے میں اسے مطاع مانیے، اس کے بغیر ہزاروں میلادیں کر کے اور لاکھوں جھنڈے اُٹھا کر اگر آپ یہ سمجھیں کہ آپ نے رسول کو ماننے کا حق اَدا کر دیا اور آپ اس کی شفاعت کے حقدار ہو گئے، یا اس کی تعلیمات کا مذاق اُڑا کر اور پُوری زندگی میں اس کے خلاف چل کر اگر آپ امید رکھتے ہیں کہ ٹھنڈے ٹھنڈے جنّت کو چلے جائیں گے تو مَیں پُوری ذمّہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ جھوٹا وہم اور کوئی نہیں۔ آپ کو مجبور کر کے اسوۂ رسُولؐ سے ہٹایا جا سکتا ہے۔ لیکن رسُولؐ کے اُسوہ سے اگر آپ خود بھاگ کھڑے ہوں، اس کو آپ خود مطاع نہ مانیں تو رسول کو رسول ماننے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یاد رکھیے کہ رسول کی تعلیم کے خلاف شک نفاق ہے اور اس کی مخالفت کفر ہے۔

اللہ نے جو دین آپ کو دیا ہے اس کا نام اسلام رکھا ہے، اسلام کے معنیٰ ہیں اپنے آپ کو بالکلیہ اللہ کے حوالے کر دینا، اس کی تشریح قرآن نے اس طرح کی ہے: "اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً اللہ کی اطاعت میں پُورے کے پُورے داخل ہو جاؤ۔" یعنی آپ اپنی زندگی کا تجزیہ نہیں کر سکتے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں اس دین کی پیروی کرنی پڑے گی۔ کاروبار کریں، ملازمت کریں، تعلیم دیں، کمپنی کھولیں، گھر میں ہوں یا سوسائٹی میں، بین الاقوامی امور ہوں یا ملکی معاملات، سب میں اللہ کے دین کی پُوری پیروی کرنا، اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دینا اسلام ہے۔ اور

مسلم وہی ہے جو اس مفہوم میں اسلام کا حامل ہو۔ اسلامی زندگی سے انحراف مجبوراً ہو سکتا ہے یا نفس کے غلبے کی بنا پر، یا جہالت کی وجہ سے۔ مثلاً کوئی مضطر مجبوراً خنزیر کھالے، یا کوئی شخص ہیجانِ نفس کی وجہ سے کوئی ناجائز حرکت کر بیٹھے، یا غفلت کی وجہ سے کسی کا پاؤں غلاظت کے ڈھیر پر پڑ جائے۔ پہلی صورت میں انسان کا فرض ہے کہ اس حالت سے نکلنے کی جدوجہد کرے، دوسری صورت میں انسان کا فرض ہے کہ فوراً توبہ کرے، تیسری صورت میں اس کو چاہیے کہ جلد سے جلد اپنے آپ کو پاک کرے۔ لیکن اگر وہ غلاظت کے ڈھیر پر اپنا بستر بچھائے، وہیں اولاد پیدا کرنا شروع کر دے، وہیں اپنی نسل کو پروان چڑھائے اور اس پر فخر بھی کرے کہ ہم نے شیش محل بنوا لیا ہے اور آپ بھی اِسے قابلِ رشک مسلمان سمجھنے لگیں تو یہ ایک غلط فہمی ہے، جس سے دماغ کو پاک کیجئے، اس کا غلط ہونا مسلّم ہے۔ کوئی غبی ہی ہوگا جو اس میں شک کرے۔

ایمان بالکتاب

رسولؐ کے علاوہ خدائے تعالیٰ نے کتاب بھی بھیجی ہے۔ وہ جنتر منتر کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ غیر مسلم بھی مانتے ہیں کہ یہ آسمان کے نیچے ان کتابوں میں سے ہے جن سے دنیا میں انقلابِ عظیم برپا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے سب سے بڑا اور سب سے زیادہ صالح انقلاب برپا کیا۔ یہ قوموں کے لیے عروج و زوال کا پیمانہ بن کر نازل ہوئی ہے۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے عرب کی گئی گذری قوم کو دنیا کی قوموں کا امام بنا

دیا، اور دُوسری تمام بڑی بڑی قوموں کے فاسد تمدّنوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ اس نے اونٹ چرانے والوں کے ہاتھوں سے اونٹوں کی نکیل لے لی اور قوموں کی قیادت کی باگ ان کے ہاتھوں میں دے دی، اور انہی اونٹ چرانے والوں میں اس کے فیض سے ایسے ایسے لوگ پیدا ہوئے کہ پُوری انسانیّت کی تاریخ ان کے ناموں سے روشن ہے۔ یہ کتاب ہماری زندگی کے ہر گوشے کے لیے ہدایت بنا کر بھیجی گئی ہے۔ یہ فرمانِ الٰہی ہے، واجب الاطاعت ہے، اس میں شک اور تفریق کی گنجائش نہیں۔ کوئی مسلمان جان بُوجھ کر اور ٹھنڈے دل سے اس سے منحرف ہو کر اپنے تئیں مسلمان نہیں باقی رکھ سکتا۔ جب تک اس کے دَم میں دَم ہے وہ اس پر جمار ہے گا۔ اگر جہالت کی وجہ سے اس سے بھٹک جائیگا تو ہوش آنے کے بعد اس کی طرف لوٹے گا۔ اور اگر اس سے زبردستی اس کو دُور کر دیا جائے گا تو یہ دُوری ایسی ہو گی جیسی ایک مچھلی کی دُوری تالاب سے۔ وہ بہر صورت اس سے علیٰحدگی پر کبھی راضی نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس کا سر تن سے جُدا ہو جائے، اگرچہ اس راہ میں اُسے سب کچھ کھو دینا پڑے۔

اس کتابِ عزیز کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیّت صرف یہ نہیں ہے کہ اگر وہ کبھی زمین پر گر جائے تو اس کے برابر گیہوں تول کر صدقہ کر دیا جائے، اس کا جُزودان نہایت عمدہ مخمل کا ہو، سُتھری الماری میں اُسے رکھا جائے اور ہر گز ہر گز یہ بھی نہیں کہ کوئی مَرنے لگے تو اس پر سورۂ یٰسین پڑھ کر دَم کر دیجیئے۔ وہ جان نکالنے کے لیے سہولت

کا نسخہ ہی بن کر نہیں آئی ہے بلکہ انسان کے لیے ہدایت اور حیات کا سرچشمہ بن کر آئی ہے۔ سورج تاریک ہو جائے تو جہان تاریک نہ ہوگا۔ چاند بے نور ہو جائے تو دنیا اندھیری نہ ہوگی۔ ستارے بکھر جائیں تو کوئی انقلاب برپا نہ ہوگا۔ لیکن اگر قرآن جہان سے غائب ہو جائے تو پھر دنیا کو کہیں سے روشنی نہیں مل سکتی۔ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ۔

یہ کتابِ عزیز وہ ہے جو تہذیب و تمدّن اور نیکی و سعادت کا سرچشمہ ہے۔ اُس ظالم انسان کے جواب میں جس نے کہا تھا کہ "جب تک یہ کتاب باقی ہے دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا"، میں یہ کہتا ہوں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی تباہی بھی دنیا سے نیکی اور امن و عدل کے آثار نہیں مٹا سکتی۔ اگر یہ کتاب صفحۂ عالم پر موجود ہے، اسے جاننا، اس پر ایمان لانا، اس کے مطابق عمل کرنا، اس کے علم و عمل کو وراثت میں منتقل کرنا، اس کے لیے گردن کٹانا ہمارے فرائض اور اس کتاب کے حقوق میں سے ہے۔ یہ ہمارے دین کے مسلّمات میں سے ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ ہمارا رشتہ خون کی بنا پر نہیں ہے، اس کتاب کی بنا پر ہے، جو اس کو مانتا ہے وہ ہمارا ہے اور ہم اس کے ہیں، اور جو اس سے منحرف ہے نہ وہ ہمارا ہے نہ ہم اُس کے ہیں۔ نَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ ط

ہمارے مدرسوں کے امتحان میں کچھ سوالات اختیاری بھی ہوتے ہیں۔ لیکن قرآن میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اختیاری ہو۔ ہم کو پورا قرآن ماننا پڑے گا۔ اس کی ایک چیز کا انکار سب کا انکار ہے خواہ وہ

چھوٹی سے چھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔ خداوند تعالیٰ ہمارا محتاج نہیں ہے کہ ہم جتنی بھی اس کی اطاعت کریں اتنے ہی پر راضی ہو جائے کہ چلو اگر یہ سو فیصدی مطیع نہیں ہیں تو ان سے ۵۰ فی صدی ہی قبول کر لو، نہیں بلکہ رسولؐ کو حکم ملا ہے کہ پورے کا پورا قرآن پیش کریں، جسے لینا ہے اسے پورا لے ورنہ پورا چھوڑ دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اہلِ رِدّہ نے کس چیز کا انکار کیا تھا؟ صرف زکوٰۃ ہی کا تو کیا تھا۔ صحابہؓ کی مجلس میں معاملہ پیش ہوا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ اگر انہوں نے ایک بکری کا بچہ بھی دینے سے انکار کیا تو میں اُن سے جہاد کروں گا۔ اور اگر اور کوئی تیار نہ ہوگا تو میں تن تنہا تلوار لے کر نکلوں گا۔ سب صحابہؓ نے اس سے اتفاق کیا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ احکامِ دین میں ہم کسی قسم کی تفریق و تقسیم نہیں کر سکتے۔

حق و باطل کے معرکے میں ہمارا فرض

اسلام کے ساتھ ہماری نسبت ان مسلّمات ہی کے تسلیم کرنے سے قائم ہے۔ یہ بُنیادی اصُول ہیں جن پر ہم سب مسلمان متفق ہیں۔ ان پر قائم رہنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ شیطان کا کام ہی یہ ہے کہ ترغیب سے ترہیب اور دلوں میں وسوسہ اندازی کر کے خدا سے بغاوت کی راہ پر لائے۔ لیکن ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم کم سے کم اتنی ہمّت تو دکھائیں کہ شیطان کو دانتوں پسینہ آجائے۔ یہ کیا ہے کہ اپنے آپ کو بزدلانہ طاغوت کے حوالے بھی کر دیں اور دینداری کا دعویٰ بھی کرتے رہیں۔ خدا سے بھی تعلق رکھیں

اور اہرمن سے بھی - اس پر ایک لطیفہ یاد آیا کہیے تو عرض کر دوں - کوئی مسلمان ہوا، لیکن اس کے باوجود جب وہ کسی مندر کے سامنے سے گزرتا تو مورتیوں کے آگے ڈنڈوت بھی کر لیتا - کسی نے کہا کہ مسلمان ہونے کے بعد یہ حرکت اچھی نہیں ہے - اس نے کہا "بھئی بگاڑ کسی سے اچھا نہیں ہے" - دینِ حق میں معاف کیجئے اس رواداری کی گنجائش نہیں ہے - مسیح علیہ السّلام نے کہا ہے - "جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا دشمن ہے" - یہی بات اگر انگریز کہنے کی جرأت کر سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں کہہ سکتے!

حق و باطل کی لڑائی قدیمی ہے جو باوا آدم کے وقت سے چلی آ رہی ہے، یہ جنگ عقلی بھی ہے، اخلاقی بھی ہے اور مادی بھی - ہم ایک ہی ساتھ اللہ اور اہرمن دونوں کو خوش نہیں کر سکتے -

مَیں آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ دین کے مسلّم مسائل ہیں - کیا مسلمان موجودہ حالات میں اسلام کے ان مقتضیات کو پورا کر رہے ہیں؟ ہم تو ٹھنڈی سڑک سے جنّت تک پہنچنا چاہتے ہیں - حالانکہ "حفت الجنۃ بالمکارہ جنّت ناگوار شدائد سے گھیر دی گئی ہے" - یہ حضورؐ نے فرمایا ہے - ہمیں لامحالہ جان و مال کی بازی کھیلنی پڑے گی - اس طرح کی "سہل پسند" قسم کی زندگی صرف ایک شکل میں اختیار کی جا سکتی ہے کہ آدمی کا کوئی اصول نہ ہو، لیکن جب کوئی اصول اختیار کیا جائے گا تو زندگی کی راہ کانٹوں سے بھر جائے گی، یا تو ہر تیز رَو کے پیچھے بھاگیے یا ایک اصول اختیار کرنے کے بعد اس کے لیے تن من اور دھن کی قربانی کیجئے - ڈاور

دو مِل کر چار ہوتے ہیں۔ اگر آپ اتنی سی بات بھی مان لیتے ہیں تو حساب درست کرنے کے لیے راتوں کو کتنی نیند خراب کرنی پڑتی ہے اور کتنا تیل جلانا پڑتا ہے۔ لیکن اگر آپ کا خیال ہو کہ دو اور دو مِل کر چار بھی ہوتے ہیں اور چھ بھی، آٹھ بھی ہوتے ہیں اور سولہ بھی تو پھر دردسری کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ غور تو کیجئے، جب مسلمان اتنے مسلّمات مانتا ہے تو اسے کتنا خون جلانا پڑے گا۔

مسلمانوں کے اقسام

اس وقت کے مسلمانوں کا جائزہ لیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے اقسام بے شمار ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ مجھے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ سانپوں کی قسمیں گِن سکتے ہیں، لیکن مسلمانوں کی اقسام شمار نہیں کی جا سکتیں۔ ظاہر ہے کہ مسلمان کی اتنی قسمیں نہیں ہو سکتی ہیں۔ مسلمان صرف ایک ہی قسم کا ہو سکتا ہے، اللہ اور اس کی شریعت کا پابند! رسول اور اس کی تعلیمات کا فرمانبردار! ان مسلّمات کا اعتراف اور پھر ان سے بغاوت دو متضاد باتیں ہیں جن کا افسوس ہے اس زمانہ میں کم لوگوں کو شعور ہے۔

دنیا کی کوئی قوم بھی اتنے سچّے اور پکّے اصُولوں کو نہیں مانتی جتنے کہ آپ مانتے ہیں پھر بھی آپ اتنی میٹھی نیند سو رہے ہیں کہ آپ کے دشمنوں کو بھی حیرت ہے، جس نے بھی کوئی اصُول اپنایا، اسے قربانیاں لازمی طور پر کرنی پڑیں۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ موجودہ حالات پر نظر ڈالیے

جس نے کہا جمہوریت ہمارا مسلک ہے۔ دیکھیے اس کو یہ سودا کتنا مہنگا پڑا۔ بعض نے کہا کہ ہم ڈکٹیٹر شپ کے قائل ہیں اور ساتھ ہی انہیں جان و مال کی بازی لگا دینی پڑی۔ روس نے نہ جانے کس عالم میں کہہ دیا تھا کہ فلاحِ عالم اشتراکیت میں ہے۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ پورے کا پورا ملک تہس نہس ہو گیا۔ نازی ازم اتنی جاں نثاری کا مطالبہ کرے۔ اشتراکیت کے سر بکف جانفروشوں کی تعداد اس قدر عظیم الشان ہو، جمہوریت کی حمایت کے لیے اتنے سرفروش تن من دھن کی بازی لگا رہے ہوں۔ مگر آپ خدا اور اس کے دین کو مان کر کتبِ قدیمہ کی زبان میں پہاڑی کا چراغ اور زمین کا نمک ہو کر اور قرآن سے خیر الامم کا خطاب پا کر آپ کے بستر میں ایک کانٹے کی خلش بھی نہ ہو۔ اور پھر بھی سب حقوق ادا ہوتے رہیں۔ جس راہ پر چاہیں چلیں اور پھر بھی کوئی اصول نہ ٹوٹے کس قدر اچنبھے کی بات ہے۔ موجودہ پڑھے لکھے انسان جو دائرۂ اسلام سے باہر ہیں، اور خود کسی اصول کو مانتے ہیں، حیرت میں ہیں کہ آپ لوگ کیسے سکھ کی نیند سو رہے ہیں، جس کی حفاظت میں اتنا بڑا خزانہ ہو اس کی یہ بے فکری تعجب انگیز ہے۔

یہ اگر مسلّم مقاصد ہیں اور آپ نے ان کو مانا ہے تو ان کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے پہلے خود انہیں اختیار کیجیے، پھر اللہ کے بندوں میں ان کو پھیلائیے۔ ان کے لیے گھر سے لے کر باہر تک اور شہر سے لے کر ملک تک آپ کو ہر جگہ جان جوکھم کا کام کرنا ہو گا۔ موجودہ زمانے میں لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں ایسے انسان موجود ہیں جنہوں نے اپنے باطل اصولوں

کی خاطر گھر چھوڑا، وطن چھوڑا، اعزہ، خاندان اور قوم سب کو قربان کیا۔ ایسے انسان ہزارہا موجود ہیں جو عین دشمن کے ملک میں ہزاروں فٹ کی بلندی سے جست لگاتے ہیں۔ دنیا باطل کے لیے اس جوش و ولولہ کا اظہار کرے مگر صرف حق ہی ایک ایسا مظلوم ہے جس کے لیے چوٹ کھانے والے سینے نہیں ہیں، جن کے لیے رگوں کا خون خشک ہو گیا ہے جس کے لیے جیبوں میں مال موجود نہیں ہے۔ اللہ اکبر، کیسا عجیب ماجرا ہے؟ کیا حق کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتا اور کیا وہ کسی چیز کا بھی مستحق نہیں ہے؟ آج وہ مسلمان جو خدا اور رسول کے اصولوں کو اپنا اصول تسلیم کیے ہوئے ہیں کہاں سوئے ہوئے ہیں؟ یا تو یہ کہیے کہ یہ مقصد گھٹیا ہے اور اگر گھٹیا نہیں ہے بلکہ تمام مقصدوں میں سب سے ارفع یہی ہے تو بتائیے کہ قیامت کے دن آپ کا کیا جواب ہو گا جب کہ اس آسمان کے نیچے کوئی جماعت آج ایسی نہیں ہے جو اس حق کو اپنا مقصدِ حیات بنائے ہوئے ہو؟ صرف کسی جزئی حق کو نہیں بلکہ پورے کے پورے حق کو، کیوں کہ ویسے تو دنیا میں کوئی جماعت ایسی نہیں ہو سکتی جس کے مقاصد میں کچھ نہ کچھ حق کے اجزاء شامل نہ ہوں، اس کے بغیر تو کوئی جماعت وجود ہی میں نہیں آ سکتی، دنیا میں مجرد باطل کا وجود ناممکن ہے، ایسا ہونا اس کائنات کے مزاج کے خلاف ہے۔ ہمارا سوال ایسی جماعت کے لیے ہے جو حق کو بہ حیثیت مجموعی لے کر اُٹھے، اس طرح جس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم لے کر اُٹھے تھے۔

تحریکِ اسلامی کا قیام اور اسکی غرض

تحریکِ اسلامی کا قیام اسی مقصدِ حق کے لیے ہے۔ ہم ان مسلمانوں کو چھانٹ چھانٹ کر جمع کر رہے ہیں جو اس پُورے حق کو لے کر اُٹھنے کا عزم رکھتے ہیں، اور ..... اس طرح ہم اسلام کے ان مقاصد کو ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، جو صرف اجتماعی زندگی میں پُورے ہو سکتے ہیں، ابھی یہ تحریک کمزور اور ضعیف ہے۔ لیکن اگر کچھ ذرّے اکٹھے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان ذرّوں میں کبھی گرمی اور حرارت پیدا کی اور اُن میں کچھ صلاحیّت پیدا ہو گئی، تو کیا عجب ہے کہ اس کمزور گروہ کے ہاتھوں دین کی وہ خدمت انجام پائے جو اللہ کو، اس کے رسولؐ کو اور تمام مومنین کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اللہ ہمیں اس کام کے لیے سچّا خادم بنا دے۔

ان اُمور میں کسی کے لیے اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ یُوں تو بحث کرنے کے لیے سب کے منہ میں زبان ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مسلّم مسائل ہیں۔ کوئی جماعت نہ تھی جو اس مقصدِ خالص کے لیے جدوجہد کر رہی ہو، باطل سے باطل مقاصد کے لیے جماعتیں ہوں، ان کے لیے بڑی بڑی قربانیاں کرنے والے ہوں، لیکن اس آسمان کے نیچے جو سب سے بڑا مقصد ہو اسی کے لیے کچھ نہ ہو، کس قدر غم انگیز بات ہے۔ اس مقصد کے لیے کچھ خدا کے بندے اکٹھے ہو گئے، سمجھانے اور سمجھنے میں ذرا دیر

لگے گی مگر دنیا سمجھے گی ضرور۔ اور اگر نیّتوں میں خلوص ہے تو جس وقت شیطان اپنی فوج لے کر نکلے گا تو ہم اس مبارک ذاتؐ کے اسوہ کی پیروی کریں گے جس نے ہزاروں غرقِ آہن جنگجوؤں کے سامنے تین سو تیرہ بے سرو سامان لا کھڑے کیے تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہی کے ذریعہ سے حق کا بول بالا کیا تھا۔

پھر اگر ہم نے اس جدوجہد میں بازی پالی تو فھوالمراد، اور اگر دوسری بات ہوئی تب بھی تمام راستوں میں ایک حق ہی کا راستہ ایسا راستہ ہے جس میں ناکامیابی کا کوئی سوال نہیں۔ اس میں اوّل قدم بھی منزل ہے اور آخر بھی، ناکامی کا اس کوچہ میں گذر ہی نہیں ہے۔ اس کو مان لینے اور اس پر چلنے کا عزم راسخ کر لینے کی ضرورت ہے۔ پھر اگر تیز سواری مِل گئی تو فبہا، یہ نہ سہی تو چھکڑے ملیں گے، انہی سے سفر ہو گا۔ یہ بھی نہیں تو دو پاؤں موجود ہیں ان سے چلیں گے، پاؤں بھی نہ رہیں تو آنکھیں تو ہیں، ان سے نشانِ منزل دیکھیں گے۔ آنکھیں بھی اگر بے نور ہو جائیں تو دل کی آنکھ تو ہے، جس کی بصارت کو کوئی سلب نہیں کر سکتا بشرطیکہ ایمان موجود ہو۔ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ط "میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔" پس وسائلِ کار اور اسبابِ راہ کا سوال ہمارے یہاں بالکل ایک ضمنی شے ہے۔

کامیابی کا معیار

دُوسری راہوں میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کہاں تک پہنچے، زادِ راہ کیا ہے، اور منزل کتنی باقی ہے۔ کامیابی کے امکانات کا حساب ہوتا ہے۔ لیکن ہماری کامیابی کا معیار یہ ہے کہ حسنِ نیّت اور اخلاص کس قدر تھا۔ یہ کوئی نہیں پُوچھتا کہ کتنے قدم چلے۔ پہلے قدم پر موت آگئی تب بھی کامرانی ہے، اور منزل تک پہنچ گئے تو پھر کہنا ہی کیا ہے۔ ایمانِ خالص اس سفر میں زادِ راہ ہے، اور عزم صادق راحلہ ہے۔ جو اپنی جانیں اللہ کی نذر کر چکے وہ کامیاب ہو چکے، جو باقی ہیں وہ جس دن نذر گذران دیں گے کامیاب ہو جائیں گے۔ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا[1] ط (الاحزاب: ۲۳)

کامیابی و ناکامی کا حساب نہ لگائیے۔ مجھے فی صد کے لفظ سے سخت نفرت ہے، یہ کام بہرحال ہمیں کرنا ہے، حالات نامساعد ہیں تو ہوا کریں، دنیا میں کب حق کا خیر مقدم کیا گیا ہے؟ کب ایسا ہوا کہ اہلِ حق چلے ہوں اور چوبداروں نے اُن کے آگے "ہٹو بچو" کی صدائیں بلند کی ہوں۔ حق کی راہ میں طائف اور غارِ ثور، خندق اور احزاب کا ہونا ضروری ہے۔ حق کی خاطر رسُولؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، دندانِ مبارک شہید کیے گئے، سر پر اوجھ ڈالی گئی، ہر طرح کی اذیّت پہنچائی گئی۔ بدقسمت ہیں ہمارے وجود اگر ہماری ایک ہڈی بھی نہ ٹوٹے۔ حق پرستی کی راہ میں کب مشکلات

---

[1] کچھ لوگ ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا اس عہد کو جو انہوں نے اللہ سے کیا۔ پس ان میں سے بعض ایسے ہیں جنہوں نے اپنی نذر پیش کر دی ہے اور بعض انتظار کر رہے ہیں اور انہوں نے کوئی تبدیلی (عہد میں) نہیں کی۔

حائل نہ تھیں، تاریخ کا جو ورق حق کے لیے مشکلات سے خالی ہو اُسے اُٹھا کر لائیے میں اس کو چُوم لوں۔

مشکلات تو اس راہ میں اعوان و انصار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ یہاں ناکامیابی کا وجود ہی نہیں، نہ صرف یہ کہ ایک قدم بھی اُٹھ جائے، تو کامیابی ہے بلکہ جس راستے پر آپ گامزن ہیں اگر اس سے آپ پیچھے ہٹ جائیں جب بھی کامیابی ہے بشرطیکہ آپ خود پیچھے نہ بھاگے ہوں۔ اہلِ حق نے شکستیں بھی کھائی ہیں لیکن ان شکستوں پر ہزار فتح مندیاں قربان۔ یہ کس قدر مضحکہ انگیز بات ہے کہ شیطان سے پورا تعاون کیا جائے اور پھر رَبَّنَا ثَبِّتْ اَقْدَامنَا کی دعا مانگی جائے۔ اس دعا کے اثرات کو تو وہ قلبِ مومن ہی جان سکتا ہے جس کے سر پر حق کی راہ میں اوجھ ڈالی گئی، جس کے دندانِ مبارک زخمی ہوئے۔ طائف کی پتھریلی زمین میں جس کے پاؤں لہولہان ہوئے۔ جب وہ کہتا ہے رَبَّنَا ثَبِّتْ اَقْدَامنَا تب زمین سے آسمان تک لرزہ پڑ جاتا ہے، خدا نے اپنی کتاب میں کوئی بے معنی بات نہیں فرمائی ہے۔ سوچئے تو سہی اگر کوئی آدمی حق کو پیٹھ دکھا دے، اور پھر دعا کرے کہ اے پروردگار! مجھے ثابت قدم رکھ، تو اس کی یہ دعا کتنی بے معنیٰ ہو گی، بہر حال ہماری پکار اسی راستہ کے لیے ہے، بدگمانیوں کا ہمارے پاس کوئی مداوا نہیں ہے۔ لیکن خوب سُن لیجئے کہ اللہ کے پیغام کے علاوہ ہمارا [illegible]پیغام نہیں، رسولؐ کی سنّت کے سوا ہمارے لیے کوئی سنّت نہیں۔ کتاب موجود ہے، غلطی دیکھیں ٹوک دیجئے۔ صاف الفاظ میں کہہ دوں، کافر ہو جو انکار کرے۔ ہم

پر ہر شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیم سے حجّت قائم کر سکتا ہے، باقی سارے قیل وقال کو ہم نے تج دیا ہے۔ ہم اپنا راستہ اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، آپ اگر چلنے کے لیے راضی ہیں تو آپ کے لیے مبارک ہے، کیونکہ یہ آپ کا فرض ہے، ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں درخواست نہیں کرتے، یہ ہماری دلی تمنّا ہے اور یہ بڑی سے بڑی چیز ہے جو ہم چاہ سکتے ہیں۔

ہم اسلام کے راستے میں خود بڑا حجاب بن گئے ہیں، وہ قوم اسلام کی وارث بنی ہے جو حق کو خود ذبح کرتی ہے، دوسروں کو جھٹکا نہیں کرنے دیتی۔ حالانکہ آپ کا تعلق کسی قوم سے نہیں ہے جو کلمہ کا دوست ہے آپکا دوست ہے، جو حق کا باغی ہے آپ کا باغی ہے۔ آپ کا تعلّق اللہ کے دین ہی سے ہے۔ جس دن دنیا پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ آپ خدا کے دین کی سربلندی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کے لیے دنیا بالکل بدل گئی ہے۔ آپ کے لیے پتھروں کے دل موم ہو جائیں گے اور بہرے کانوں میں بھی سماعتِ حق کی صلاحیّت پیدا ہو جائے گی۔ حق کے ساتھ فطرتِ انسانی کو ازلی محبّت ہے، بشرطیکہ حق اس کے سامنے بے حجاب ہو کر آئے۔

نصرتِ حق کب آتی ہے؟

حضرات! اس حقیقت کو فراموش نہ کیجئے کہ سنت اللہ یہ نہیں ہے

کہ ہم دین کو چاہیں یا نہ چاہیں، اللہ تعالیٰ اپنے زور سے اس کو زمین میں جاری وقائم کر دے۔ اقامتِ دین تو بندگی کے کاموں میں سے ہے، اور بندگی بندوں کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ ہماری طرف سے نماز پڑھے گا، نہ روزہ رکھے گا، نہ زکوٰۃ دے گا، نہ حج کرے گا اور نہ کوئی حکم بجا لائے گا۔ یہ سارے کام ہمارے کرنے کے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر ہم ان کاموں کے کرنے کا عزم بالجزم کر لیں گے اور ان کی اقامت کی راہ میں اپنی عزیز سے عزیز چیزوں کو قربان کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں گے تو خدا اور اس کے فرشتوں کی مدد ہمارے ساتھ ہو گی۔ پس آپ اس بات کا ہرگز انتظار نہ کیجئے کہ اللہ تعالیٰ خود توحید کا پرچم سارے عالم میں لہرا دے گا۔ اس کے لیے تو بہر حال ہم ہی کو سر دھڑ کی بازی لگانی پڑے گی اور اپنے سر و سینہ کو زخمی کرانا ہو گا۔ ہاں جب اس راہ میں ہم وہ سب کچھ کھو دیں گے جو ہمارے پاس ہے تو ہمیں وہ سب کچھ مل جائے گا جو اس راہ کے خطرات برداشت کرنے والوں کے لیے اللہ کے پاس ہے اور وہ بڑی چیز ہے۔

اقامتِ حق کی راہ کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اپنے آپ سے لڑ کر پہلے اپنے اُوپر اللہ کی اطاعت کو لازم کیجئے اور اپنے نفس کو اللہ کا فرماں بردار بنائیے، اللہ کی راہ میں وہی لوگ لڑ سکتے ہیں جو اس راہ میں اپنے نفس کو شکست دے چکے ہیں، یہ کام فارموں کے پُر کر دینے سے نہیں ہو سکتا، اس کے لیے بڑی ریاضت اور نفس کشی کی ضرورت ہو گی۔

اپنی زندگی کا احتساب کرنا اور اپنے اوپر اللہ کے دین کو قائم کرنا کوئی سہل کام نہیں ہے، سب سے زیادہ انسان خود اپنے نفس سے شکست کھاتا ہے، اپنے اندر کا حریف آدمی کو بہت جلد چت کر لیتا ہے۔ اس وجہ سے سب سے پہلے اس محاذ پر فتح پالینا ضروری ہے۔

جو نجاستیں آپ نے از خود اپنے اوپر لاد لی ہیں اُن کو فوراً دُور کر دیجئے اور جو چیزیں آپ کی مرضی کے خلاف مسلّط ہو گئی ہیں، اُن کو دُور کرنے کے لیے اجتماعی جدوجہد کا سامان کیجئے۔ اگر آپ کی زندگی صحیح نہج پر آ گئی اور آپ نے اپنے اوپر دین کو قائم کر لیا تو آپ کی آنکھوں کے اشاروں سے وہ کام ہوں گے جو بڑے بڑے مقالوں سے نہیں ہو سکتے۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہے عمل کی زبان سے کہنا ہے، منہ کی زبان سے بہت کم کہنا ہے، آپ اپنے مقصد کے عملی داعی اور ترجمان بنیں۔

اس بات کو خوب یاد رکھیے کہ ہمارے لیے یہ ذرا بھی فخر کی بات نہیں ہے کہ ہم اس مقصد کے لیے اُٹھے ہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر اَدا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمارے دلوں میں اپنی بندگی کا نیک ارادہ ڈالا اور اس پر چلنے کی توفیق عطا فرمائی۔ فخر و غرور سے بہت ڈرنا چاہیئے اور ہر وقت اپنے رب سے چمٹے رہنا چاہیے۔ ہر عزم، خواہ حق ہو یا باطل امتحان کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ دیر یا سویر آپ کے ارادے کی پختگی بھی آزمائی جائے گی۔ جس کام کو آپ لے کر اُٹھے ہیں اس آسمان کے نیچے سب سے مشکل کام یہی ہے۔ اس کام میں کچ دِلے اور خام

آدمیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس راہ میں کامیابیوں سے پہلے صعوبتوں کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اور تحسین و آفرین سے زیادہ ملامت کے تیروں کے لیے سینہ سپر رہنا چاہیے۔ تحسین اس راہ میں صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے، اور مبارک ہیں وہ جو اللہ تعالیٰ کی تحسین کے سزاوار ٹھیریں۔

اس امر واقعی سے بھی کبھی غفلت نہ ہو کہ ہمارے اور دوسرے بھائیوں کے درمیان فرق کفر و اسلام کا نہیں بلکہ پورے اور جزئی حق اور طریقِ کار کا فرق ہے۔ یہ فرق کچھ عرصے تک باقی رہے گا۔ بہت ممکن ہے کہ اس کے سبب سے کچھ غلط فہمیاں اور بدگمانیاں بھی پیدا ہوتی رہیں۔ لیکن اگر ہم مضبوطی کے ساتھ اپنے مقصد پر قائم رہے اور ضمنی بحثوں میں نہ اُلجھے تو یہ بدگمانیاں آپ سے آپ رفع ہو جائیں گی۔ نفسِ انسانی کی یہ بہت بڑی کمزوری ہے کہ وہ اپنا صحیح جائزہ لینے میں ہمیشہ مداہنت کرتا ہے اور اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ الاؤنس کا مستحق سمجھتا ہے۔ اس وجہ سے ہمارا احتساب اور بے لاگ تبصرہ لوگوں کو کھلتا ہے، لیکن سچائی بہرحال سچائی ہے۔ اگر صبح طلوع ہو چکی ہے تو شب کا پردہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ آنکھیں کھلیں گی اور حقائق نظر آنے لگیں گے۔ اور جو لوگ بدگمانیوں کی بیماری میں مبتلا رہنے کے خواہش مند نہیں ہیں وہ انشاء اللہ ہمارے رفیقِ کار بنیں گے۔ اتنے قلیل عرصہ میں بھی جو کچھ ہو چکا ہے اس میں ہمارے لیے مایوسی اور دل گرفتگی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہم نے اپنے خلوص کی نہایت حقیر متاع اس راہ میں پیش

کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے صلے میں کام کی بہت سی راہیں کھول دیں۔ ہم کو جو استعداد آج حاصل ہے اگر ہم نے اس کو صحیح طور پر استعمال کیا تو انشاء اللہ اس سے بڑے کاموں کی راہیں کھلیں گی۔ جو ایک پیسے میں اپنے آپ کو امین ثابت کر دیتا ہے وہ مستحق ٹھیرتا ہے کہ اس کو ایک لاکھ کی امانت سونپی جائے۔

دعوتِ اسلامی

اور

اُس پر لبّیک کہنے والوں کے فرائض

از

میاں طفیل محمّد صاحب

"حیرت ہے کہ ریت کے ذرّے بھی اتنی تعداد میں کسی خطّہ ارض میں جمع ہو جائیں تو اسے ریگستان بنا دیتے ہیں۔ اور پانی کے قطرے بھی اس تعداد میں کہیں جمع ہو جائیں تو وہ سیلاب بن کر بہہ نکلتے ہیں۔ لیکن دنیا میں اتنے مسلمان موجود ہوتے ہوئے بھی نظامِ اسلامی کہیں قائم نہیں۔ خدا کے لیے خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر اپنے اعمال پر تنقیدی نگاہ ڈالیے۔ یہود کے نقشِ قدم پر چلتے رہو گے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہود کا سا برتاؤ آپ کے ساتھ نہ کیا جائے۔"

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

(یہ مضمون ابتداءً محرم ۶۴ھ میں .....
ایک پیغام کی صورت میں شائع ہوا تھا۔ پھر کچھ اضافے کے
ساتھ اسے اس مجموعے میں شامل کر دیا گیا۔)

صاحبو! وقت بڑی تیزی سے گزرتا چلا جا رہا ہے۔ زندگی لحظہ بہ لحظہ کم ہو رہی ہے۔ اس دنیا میں جینے کی جو مہلت ہمیں بخشی گئی تھی، وہ ایک سال اور کم ہو گئی۔ اور حساب کا دن ایک برس اور قریب آ گیا۔ لیکن کتنے لوگ ہیں جن کو اس امر کا احساس ہوا اور جو اپنی زندگی کے اصل مقصد کو سمجھنے اور پورا کرنے کی طرف متوجہ ہوئے؟ غالباً انسانوں کی اسی غفلت اور ناعاقبت اندیشی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمۡ وَهُمۡ فِیۡ غَفۡلَةٍ مُّعۡرِضُوۡنَ یعنی لوگوں کے حساب کا وقت تو بالکل ان کے سر پر آ گیا ہے، مگر وہ ہیں کہ غفلت میں پڑے بہے جا رہے ہیں اور چرنے چگنے سے آگے کسی بات کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے!

گزری ہوئی زندگی کا محاسبہ

برادرانِ محترم! ابھی وقت ہے کہ ذرا دُور اندیشی سے کام لے کر ہم اپنی گذشتہ زندگی کا جائزہ لیں، اپنے نفع و نقصان کا کچھ اندازہ کریں اور یہ دیکھیں کہ جس جنسِ زندگی اور اس کے ساز و سامان کو امانتاً لے کر اس دنیا کے بازار میں کچھ کمانے کے لیے آئے تھے، اس کے ساتھ ہم نے کیا کیا؟ اس کا کس قدر حصّہ نفع بخش کاموں میں لگایا، کس قدر اپنی نادانی سے بیکار کھو دیا، اور کس قدر ـــــ دانستہ یا نادانستہ ـــــ اُس صاحبِ امانت کے منشاء کے صریحاً خلاف کاموں میں خرچ کر ڈالا؟ اور یہ سوچیں کہ جس قدر سرمایہ ہم سے کھو گیا یا ہم نے کھو دیا، کیا اس کے لیے ہمارے پاس کوئی ایسے معقول وجوہ موجود ہیں کہ اس سفرِ دنیا سے واپسی پر، جب ہم اپنے اس علیم و خبیر خالق و مالک اور صاحبِ امانت کے سامنے حساب کے لیے بلائے جائیں تو درجات و مراتب پانے والے نہ سہی، قابلِ درگذر ہی قرار پا جائیں؟ اس لیے ان تمام انسانوں کو جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جزاء و سزا کے قائل ہیں عموماً، اور ان حضرات کو جو خیر امت اور شہداء علی الناس میں شمار ہونے کی تمنّا اور لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ[1] (۷:۵۴)

---

[1] جب خلق اسی کی ہے تو حکم بھی اسی کا چلنا چاہیے۔ یعنی جب مخلوق کے پیدا کرنے میں کوئی دُوسرا شریک نہیں تو فرمانروائی میں کوئی دوسرا دخیل کیسے ہو سکتا ہے۔

کا عملی پروگرام لے کر اُٹھے ہیں خصوصاً، اپنی گذشتہ زندگیوں کا ہر پہلو سے محاسبہ کر کے اندازہ کرنا چاہیے کہ اپنی زندگی کا جو سرمایہ وہ ختم کر چکے ہیں اس کا کس قدر حصّہ صاحبِ امانت کے منشاء کے مطابق، عین اسی مقصد کے لیے صرف ہُوا جس کے لیے یہ امانت عطا کی گئی تھی اور اس کا کس قدر حصّہ انہوں نے اپنی نادانی یا سرکشی سے اس کے منشاء کے خلاف خرچ کر ڈالا ہے اور اب تک کیے جا رہے ہیں؟

ان امور کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنے کے لیے ہر شخص کو پوری جُرأت رسی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے کہ ہماری جسمانی و دماغی قوّتیں اور قابلیتیں، ہماری انفرادی اور اجتماعی جدوجہد اور کوششیں، ہمارے کاروبار اور تجارتیں، ہماری من حیث المجموع دلچسپیاں اور مصروفیتیں، ہماری محبّتیں اور عداوتیں، ہمارے زیرِ تربیت آئندہ نسلیں، ہمارے مال و دولت اور جائدادیں، مختصر یہ کہ زندگی کے وہ تمام ذرائع و وسائل جو اللہ تعالیٰ نے صرف اپنی عبادت و بندگی اور فریضۂ خلافت کی تکمیل کے لیے ہمیں عطا فرمائے تھے، اب تک کن کاموں اور کن مقاصد کے لیے صَرف ہوتے رہے ہے؟ کیا وہ تمام تر نظامِ باطل کے قیام، اقتدارِ طاغوت کے استحکام اور خدا کی زمین پر فتنہ و فساد پھیلانے ہی کے لیے وقف رہے یا ان کا کوئی حصّہ دینِ حق کے لیے بھی صَرف ہُوا؟ اور اگر کچھ صَرف ہُوا تو دین کے خلاف صرف ہونے والے حصّہ سے اس کا تناسب کیا ہے؟ بالفاظِ دیگر ہمیں یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ ہماری جسمانی اور دماغی قوتیں اور قابلیتیں خدا سے بے پرواہ نظامِ زندگی

کو چلانے اور مستحکم کرنے میں کتنا حصّہ لیتی اور لے رہی ہیں اور اللہ کے دین کو قائم اور دنیا کو شر و فساد سے پاک کرنے میں کتنا حصّہ لیتی اور لے رہی ہیں؟ ہماری انفرادی اور اجتماعی جدوجہد کس حد تک مصنوعی اور خود ساختہ زندہ اور مردہ خداؤں کی خدائی کو قائم کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے وقف ہے؟ اور کس حد تک اللہ کی حاکمیّت اور اس کے مشروع نظامِ زندگی[1] کے قیام کے لیے؟ ہمارے کاروبار اور تجارتیں، کہاں تک اللہ کے مقرر کردہ حدود حرام و حلال کے مطابق چل رہے ہیں؟ اور کہاں تک ان سے آزاد اور بے پرواہ ہو کر؟ من حیث المجموع ہماری دلچسپیاں اور مصروفیّتیں، خوشنودیٔ نفس اور قربِ طاغوت کے لیے ہیں یا رضائے الٰہی کے حصول کے لیے؟ اپنی اولاد اور آئندہ نسلوں کو ہم اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ الحق ہی کی خاطر جینے اور مرنے کے لیے تیار کر رہے ہیں یا اپنی اس عزیز ترین متاع کو "مغضوب" اور "ضالّین" کے قدم بقدم چلنے کے لیے تیار کر

---

[1] اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام : اللہ کے نزدیک انسانوں کیلئے زندگی گذارنے کا صحیح راستہ اسلام ہی ہے۔ (۳ : ۱۹)

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ : جو اسلام کے سوا کوئی اور طریقِ زندگی اختیار کریگا، اسے خدا کے ہاں قبولیّت حاصل نہیں ہوگی (۳ : ۸۵)۔

وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا : میں (اللہ) نے تمہارے لیے نظامِ زندگی کے طور پر اسلام کو مقرر کیا ہے۔ (۵ : ۳)

رہے ہیں؟ ہمارے مال و دولت اور جائدادوں کا کتنا حصّہ طاغوت کے لیے ہے، کتنا خود اپنے نفس کے لیے اور کتنا دینِ حق کی جدوجہد کو پروان چڑھانے کے لیے؟ اور پھر مسلمانوں نے اپنا کتنا خون جس کی قیمت وہ اپنے رب سے عہدِ وفاداری کرتے ہی وصول کر چکے تھے، طاغوت کی وفاداری میں بہایا اور بے دریغ بہائے چلے جا رہے ہیں اور اُس کی حاکمیّت و اقتدار کی حمایت میں کتنے بچّوں کو یتیم، عورتوں کو بیوہ، ماؤں کو بے اولاد، بھائیوں کو بے بازو اور خلقِ خدا کو تباہ و برباد کر دیا؟[1] ذرا سوچیے! ضد میں مبتلا ہو کر نہیں، ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ کیا اس کی تلافی کی کوئی صورت ممکن ہے؟ پھر اب بھی ہماری روزانہ زندگی کے چوبیس گھنٹوں میں سے کتنا وقت غیر اللہ کے لیے وقف ہے اور کتنا قیامِ دین کی جدوجہد کے لیے اور اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے کے لیے؟

اگر ایک مسلمان ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ذرا ٹھنڈے دل سے چند منٹ کے لیے بھی اپنی زندگی پر نگاہ ڈالے تو وہ خود ہی فیصلہ کر لے گا کہ اس نے اس امانت کا حق جو اس کے سپرد کی گئی تھی کہاں تک ادا کیا ہے۔ اللہ کے ہاں اسے کس سلوک کا مستحق ہونا چاہیے اور جس دین اور عقیدے کا وہ دعویدار ہے اس میں کس قدر صادق اور کس قدر منافق ہے؟

---

[1] یاد رہے کہ یہ مضمون دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں لکھا گیا تھا جس وقت کہ ہزاروں لاکھوں مسلمان صرف دنیوی اغراض کے لیے یہ خدمت انجام دے رہے تھے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ[1] (۲ : ۸) اور اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ[2] (۲ : ۱۶) سے کس حد تک بچا ہُوا ہے؟

خدا کے دین کا صحیح تصوّر

برادرانِ مکرّم! اللہ کو ایک خدا ماننے کا عقلی تقاضہ ہی نہیں اللہ تعالیٰ کا واضح حکم بھی یہی ہے کہ یٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (۲ : ۲۰۸) یعنی اے اللہ پر ایمان لانے کے دعویدارو! اگر تم نے فی الواقع اس کی بندگی کی راہ (اسلام) کو قبول کیا ہے تو پھر سر تا پا اور اپنے سب کچھ سمیت اس کی بندگی میں داخل ہو۔ یہ صورت کہ کچھ معاملات میں خدا کی بات مانو اور دوسرے معاملات میں من مانی کرو یا کسی دوسرے کے پیچھے چلو، یہ صورت نہ صرف خدا کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہے بلکہ یہ خداوند تعالیٰ کے غضب اور غصّہ کو اس درجہ بھڑکانے والی ہے کہ اس

---

[1] لوگوں میں بعض ایسے ہیں جو کہتے تو ہیں کہ وہ اللہ اور یومِ آخرت کو مانتے ہیں لیکن (ان کی زندگی گواہ ہے کہ) وہ مومن ہیں نہیں۔

[2] یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی۔ اور ان کی یہ تجارت ان کے لیے کچھ بھی سود مند نہ ہوئی۔

روش پر عامل امت کو مخاطب کر کے فرمایا :

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ؟
فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج
وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ ط وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۲ : ۸۵) یعنی کیا تم خدا کی کتاب کے ایک حصّہ کو مانتے ہو اور اس کے دوسرے حصّے کو رد کرتے ہو ؟ — بتاؤ، تم (ایمان کا دعویٰ رکھنے والوں) میں سے جو لوگ (خدا کی کتاب کے ساتھ) یہ روش اختیار کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں بھی وہ ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور قیامت کے روز شدید ترین عذاب سے دوچار کیے جائیں۔ یاد رکھو، اللہ تمہاری حرکات سے بے خبر نہیں ہے۔

خدا کے دین کو اختیار کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ آدمی اپنی پوری زندگی اپنے سارے معاملات اور تعلّقات کو احکامِ الٰہی کے تابع کر دے۔ یہ احکام خواہ انفرادی زندگی سے تعلّق رکھتے ہوں یا اجتماعی زندگی سے، نماز، روزے اور حج اور زکوٰۃ سے تعلق رکھتے ہوں یا معاشرت و معیشت اور تمدن و سیاست سے، یکساں واجب الاطاعت اور واجب التعظیم ہیں۔ اپنی مرضی برتنے یا کسی دوسرے کی مرضی پر چلنے کی یا کسی رسم و رواج کی پابندی کی وہیں گنجائش ہے جہاں خدا اور اس کے رسولؐ کا کوئی حکم یا فیصلہ موجود نہ ہو، جہاں ان کا حکم یا فیصلہ موجود ہو وہاں اس سے پہلوتہی کر کے کوئی اور راہ اختیار کرنا کسی مسلمان کا کام نہیں ہے :

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۗ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔

(۳۳ : ۳۶)

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اُس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔ اس کے گمراہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

یہی نہیں، صاف صاف ارشاد فرما دیا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

(۴ : ۶۵)

اے محمدؐ! تیرے رب کی قسم، یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے تمام باہمی اختلافات میں تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں، بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔

اللہ تعالیٰ کے انہی ارشادات کی صراحت فرماتے ہوئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ۔

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی خواہش نفس تک کو بھی اس چیز کے تابع نہ کر دے جو میں لے کر آیا ہوں۔

اس طرح سے خدا کے دین اور اس کے احکام کو مانے بغیر اقرار توحید ایک قولِ بے معنی ہے۔ کلمۂ توحید کے اقرار کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ آدمی کی اپنی پوری زندگی اور اس کے سارے معاملات (عقائد وافکار، اخلاق واطوار، تہذیب وتمدّن، مذہب اور معاشرت، سیاست اور عدالت، انفرادی واجتماعی روابط، سب کے سب) خدائے واحد کی بندگی کے محور کے گرد گھومنے لگیں۔

لیکن عجیب بات ہے کہ وہی لوگ جو ایک طرف دوسرے نظاہائے زندگی کے بارے میں یہ خوب سمجھتے ہیں بلکہ پورے شرح صدر کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہیں کہ آدمی کسی نظامِ زندگی سے اس وقت تک پورا فائدہ حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ اپنے دل ودماغ سے لے کر لب ولہجہ تک اور شکل وشباہت سے لے کر چال ڈھال تک اس کے مطابق نہ بنا لے۔ وہی اُس علیم وخبیر خدا کو جس نے اپنی صفات رَبُّ النَّاسِ،

مَلِكُ النَّاسِ اور اِلٰهُ النَّاسِ اور مَلِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[1] ارشاد فرمانے کے ساتھ ساتھ ایک پورا نظامِ زندگی دے کر اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً کا حکم اور اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کی تنبیہہ بھی فرمادی ہے۔ اسے نعوذ باللہ محض ایک پجاری کے بُت کی حیثیت دے کر مسجد کی چار دیواری کے اندر محدود رکھنے پر مصر ہیں جسے بس پوجا کے وقت ڈنڈوت کر لیا جائے لیکن باقی امورِ زندگی سے اسے کوئی سروکار نہ ہو، یا پھر زیادہ سے زیادہ یہ کہ جو اختیارات ان کے دنیوی فرمانروا اُس کے رب کو بخوشی دینے پر رضامند ہوں، اس حد تک یہ اپنے رب کی اطاعت بھی کر لیں اور باقی پوری زندگی اپنے رب کے حدود سے قطع نظر غالب نظامِ باطل کی اطاعت اور بندگی میں ہی بسر کرتے رہیں۔ ان میں سے ذرا زیادہ دیندار طبقہ کچھ آگے بڑھتا ہے تو اپنے رب سے فی صدی کا سودا کرنا شروع کر دیتا ہے، اور اس فیصدی کی تعیین کے لیے حَکَم بھی خود ہی بن بیٹھتا ہے۔ چنانچہ کہیں تو لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا کی من مانی تاویلیں کر کے ہر اُس شے کو اپنی وسعت سے باہر قرار دے لیتا ہے جس میں مال و جان کا کچھ نقصان نظر آتا ہے یا جو نفس کو غیر مرغوب اور جسم و جان

---

[1] یعنی وہ زمین و آسمان کا مالک و فرمانروا ہی نہیں انسانوں کا خالق و پروردگار بھی ہے۔ ان کا خدا اور حاجت روا بھی ہے اور ان کا بادشاہ اور حاکم و فرمانروا بھی ہے۔

کو ذرا تکلیف دِہ محسوس ہوتی ہے۔ کہیں وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ[1] کو من گھڑت معنی پہنا کر نہ صرف اپنے لیے بے عملی و حجرہ نشینی بلکہ شیطان کی تجویز کردہ راہوں پر سرپٹ دوڑنے کا جواز نکال لیتا ہے۔ اور یہ بھول کر کہ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ[2] قرآن نے ان کفار و مشرکین کی صفت بیان کی تھی جو بدر میں رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) سے لڑنے اور دینِ حق کو مٹانے کے لیے چڑھ آئے تھے، دوسروں کو بھی دینِ حق کے تقاضوں سے پھیرنے اور باطل کی قوتوں سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کہیں پورے قرآن کی دعوت کو نظر انداز کر کے اور سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام پر طاغوت کی چاکری کا الزام دھر کر نظامِ باطل میں حصہ داری اور اس کے قیام کے لیے ایثار و قربانی کو مسلمانوں کے لیے واجب اور فرض کفایہ تک قرار دیتے ہیں[3]۔ اور کہیں احکامِ رجم سے یہ استدلال کرنے لگتے ہیں کہ اسلام کا نصب العین بھی یہی ہے اور اس کے حصول کے لیے طریقِ کار بھی یہی ہے جو پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن جس طرح رجم کا حکم حق اور فرض ہونے کے باوجود غلبۂ کفر کی وجہ سے اب

---

[1] اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو (۲ : ۱۹۵)

[2] اللہ کی راہ سے روکتے ہیں (۸ : ۴۸)

[3] یہ ہے وہ استدلال جو اس زمانے میں جب یہ مضمون لکھا گیا بعض بڑے بڑے علماء کی طرف سے بڑے زور سے دعوت اسلامی کے مقابلہ میں پیش کیا جا رہا تھا۔

ناقابلِ عمل ہے اسی طرح اسلامی نظام اور اس کے قیام و حصول کا طریقہ صحیح اور حق ہونے کے باوجود اب ممکن العمل نہیں رہا ہے۔ حالانکہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا میں مذکور وسعت کا فیصلہ وہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اور حشر کے روز وہ انہی لوگوں کی زندگیوں سے ایک ایک واقعہ کو سامنے لاکر بتائے گا کہ کس طرح اپنے کاموں اور مطلوب مقاصد کے لیے ساری ہی وسعتیں موجود تھیں، اور مزید برآں لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا اور وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ کی تفسیر مکّہ کی گلیوں میں، طائف کے بازاروں میں اور بدر کے میدان میں خون کی روشنائی سے لکھی ان کے سامنے آج بھی موجود ہے[1]۔ سیّدنا یوسف علیہ السّلام کی چاکری کی حقیقت خود قرآن میں وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ

---

[1] یہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا کا اعتراض شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے سامنے بھی پیش کیا گیا تھا۔ شدید گرمی کا موسم تھا اور آپ عین دوپہر کے وقت صحنِ مسجد کی تپتی ہوئی سِلوں پر ننگے سر اور ننگے پاؤں ٹہل رہے تھے۔ کسی نے عرض کیا، حضرت! اللہ تعالیٰ نے لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا فرمایا ہے اور آپ خواہ مخواہ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں میں بھی یہی اندازہ کر رہا ہوں کہ میرے رَب نے میرے اندر کتنی وسعت اور قوّتِ برداشت رکھی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ مَیں اس بارے میں کوئی غلط گمان کر کے اللہ کی راہ میں اپنی ساری قوّت صَرف کرنے سے قاصر رہوں اور آخرت میں پکڑا جاؤں۔

بِاِذْنِ اللّٰہِ[1] کے کلیہ کے ذریعے واضح کی جا چکی ہے، کہ ہر نبی خود واجب الاطاعت بن کر آتا ہے نہ کہ اس لیے کہ وہ کسی دوسرے کی اطاعت اور چاکری کرے ۔ اور ہر ممکن التصوّر نظامِ باطل کے اندر اسلامی نظام کا ممکن القیام اور اس کے طریقِ کار کا ممکن العمل ہونا، آدم علیہ السلام سے لے کر سیّدنا و مولانا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک لاکھوں انبیاء ہر دَور اور ہر قسم کے حالات میں ثابت کر چکے۔ اور پھر یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا ہو جاتی ہے کہ انہی حضرات کے لیے جب اپنے مرغوب النّفس مقاصد اور غیر اللہ کے ہاں قرب و مراتب کے حصول کا سوال ہوتا ہے تو دنیا کی بڑی سے بڑی صعوبت اُٹھانے اور بڑی سے بڑی قربانی کرنے میں نہ "وسعت کی کمی" مانع ہوتی ہے نہ "اپنے ہاتھوں ہلاکت میں پڑنے کا احتمال" رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور نہ پورے قرآن میں سے کسی ایک آیت کی کوئی خلاف ورزی واقع ہوتی ان کو نظر آتی ہے۔ صرف اللہ کے دین کے قیام کی

---

[1] (اے محمدؐ! ان کو بتاؤ کہ) ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے (۴ : ۶۴) یعنی خدا کی طرف سے رسول اس لیے نہیں آتا ہے کہ بس زبان سے اس کی رسالت کا اقرار کر لو اور پھر اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو، بلکہ رسول کے آنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ زندگی کا جو قانون وہ لے کر آیا ہے تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی کی جائے۔ اگر کسی نے یہ نہیں کیا تو پھر اس کا محض رسول کو زبان سے رسول مان لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

جدوجہد کے مطالبہ پر ہی اللہ کے کلام کی یہ تاویلات اُن کو سوجھنے لگتی ہیں۔
قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ، اِلٰهِ النَّاسِ، مِنْ شَرِّ
الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ، الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ،
مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ[1]۔

سب برادرانِ اسلام سے عموماً اور کارکنان سے
خصوصاً التجا ہے کہ اپنی زندگی کے ہر ہر لمحے اور ہر ہر معاملے میں اپنے
عقیدے اور عہد اللہ کا پاس و احساس رکھیں۔ پوری زندگی کی تعمیر اور اپنے
سارے معاملات کی اساس اسی عقیدۂ توحید کی بنیاد پر قائم کریں حتیٰ کہ
ہر دم یہ کھٹکا لگا رہے کہ ہماری زبان سے نکلنے والا کوئی کلمہ، ہمارے
دماغ میں آنے والا کوئی خیال، ہمارے ہاتھ پاؤں اور دوسرے قویٰ سے
سرزد ہونے والا کوئی عمل و حرکت اور ہماری روزانہ زندگی میں پیش آنے
والے معاملات میں سے کوئی معاملہ بھی ہمارے عقیدہ و نصب العین
سے متعارض نہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ یہ سب اُمور اور ہمارے سب کے سب
مشاغل اور کاروبار اللہ ہی کے قانون و حدود کے مطابق انجام پا رہے

---

[1] دعا کیا کرو کہ میں اس اللہ کی پناہ مانگتا ہوں جو نوعِ انسانی کا خالق و
پروردگار بھی ہے، مالک و فرمانروا بھی ہے اور خدا بھی، چھپ چھپ کر وسوسہ
اندازی کرنے والے ہر شیطان سے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے،
خواہ شیاطین جن میں سے ہو یا شیاطین انس میں سے۔ (۱۱۴ - ۱ تا ۶)

ہوں۔ اور ہماری پوری کی پوری زندگی اور اس کی ساری مصروفیتیں اس طرح سے عقیدۂ توحید کے محور کے گرد گھوم رہی ہوں کہ دنیا وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ[1] کی عملی تفسیر دیکھ لے۔ یہی تقویٰ ہے، اسی کا نام پرہیزگاری ہے اور اسی سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ مسلمان کے لیے اس کے سوا نہ کوئی اور راہ ہے اور نہ مسلمان رہتے ہوئے اس کے سوا کوئی جائز طرزِ عمل۔

کتاب و سنّت کے مطالبات، عقیدۂ توحید کے مقتضیات اور انبیاءؑ کی زندگی کے عملی سبق کو نظر انداز کر کے اور ان کی تعمیل اور پیروی سے پہلو تہی کرتے ہوئے محض چلّے کاٹ کر، کچھ اوراد جپ کر، چند ظاہری مراسم ادا کر کے، یا چند مدرسے اور یتیم خانے کھول کر اور چند انجمنیں قائم کر کے، جبکہ اللہ کا دین مغلوب ہو رہا ہو، پوری کی پوری زمین فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن رہی ہو، ظلم و ستم کا دَور دَورہ ہو، اور اللہ کا کلمہ نیچا اور غیر اللہ کا کلمہ بلند ہو رہا ہو — اگر ہم یہ خیال کریں کہ اللہ کے نزدیک کوئی مرتبہ و مقام حاصل کر لیں گے، یا اس کی کچھ خوشنودی ہی حاصل ہو جائے گی، تو یہ غلط فہمی ہے، فریبِ نفس ہے اور شیطانی وسوسہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

دینِ حق کا یہی وہ اساسی تصوّر ہے جسے ذہن نشین کرانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر پنج وقتہ نماز فرض کر کے یہ انتظام فرمایا تھا

---

[1] ہم (اللہ) نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس غرض کے لیے کیا ہے کہ بس وہ ہماری بندگی کریں اور اس راہ سے سرِ مُو اِدھر اُدھر نہ ہوں۔ (۵۱ : ۵۶)

کہ نہ صرف دین کے بنیادی حقائق اور اقرارِ توحید کے تمام مقتضیات و مطالب روزانہ بار بار بندۂ مومن کے سامنے لائے جاتے رہیں بلکہ اس سے عاید ہونے والی ذمّہ داریوں کو پُورا کرنے کا عہد بھی کم سے کم بتیس ۳۲ مرتبہ روزانہ[1] اس سے لے لیا جائے تاکہ پھر اس کے لیے عذر کی کوئی گنجائش، لاعلمی کا کوئی بہانہ، یا اتمامِ حجّت میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے ۔ بلکہ جب خدا کے روبرو حساب کے لیے وہ پیش ہو تو بجز اقبالِ جرم کے اس کے لیے اور کوئی چارۂ کار نہ ہو۔ غالباً یہی وہ منظر ہے جسے قرآن نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ	اے جنّو! اور انسانو! کیا
الْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِکُمْ	تمہارے پاس تمہیں میں سے
رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ	رسول نہیں آئے تھے جو تمہیں
عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ وَیُنْذِرُوْنَکُمْ	ہمارے احکام سے آگاہ کرتے
لِقَآءَ یَوْمِکُمْ ھٰذَا ط قَالُوْا	تھے اور ہماری اس دن کی ملاقات
شَھِدْنَا عَلٰٓی اَنْفُسِنَا وَ	سے خبردار کرتے تھے؟ وہ (جن
غَرَّتْھُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا	اور انسان سب) جواب دیں گے
وَشَھِدُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ	بے شک باری تعالیٰ ہم خود اپنے

---

[1] ہر بندۂ مومن روزانہ کم از کم بتیس ۳۲ رکعت نماز ادا کرتا ہے اور جیسا کہ آگے واضح ہوگا ہر رکعت میں پورے دین کی بنیادی باتوں کو دُہرایا جاتا ہے۔

اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۔ (الانعام : ۱۳۰) خلاف اس کی گواہی دیتے ہیں ۔ آج دنیا کی زندگی نے ان لوگوں کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے مگر اس وقت ۔ وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ انجان پنے میں نہیں بلکہ سمجھتے بوجھتے وہ خدا کی نافرمانی کی روش پر چلتے رہے ۔

نماز کا عملی مقصود

ابھی وقت ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی روزمرہ کی زندگی اور اس کے مشاغل کا پوری سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لے کر اندازہ کرے کہ ہم اپنے ان عہدوں کو جو نمازیں روزانہ پانچ وقت اللہ تعالیٰ سے استوار کرتے ہیں کہاں تک پورا کر رہے ہیں ۔ عملاً ہماری زندگی کس نہج پر جا رہی ہے اور کس حد تک ہم اللہ کی عبدیت میں فی الواقع داخل ہوئے ہیں ؟ نماز کا عملی مقصود اسی جائزے کی طرف آدمی کو بار بار متوجہ کرنا ہے ۔

نماز کا سب سے پہلا کلمہ !!

اب دیکھیے ، نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہی سب سے پہلا کلمہ جو ہمارے منہ سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ : اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (الانعام، ۷۹)

یعنی یہ کہ مَیں نے فی الحقیقت ہر طرف سے منہ موڑ کر، دوسرے تمام تعلقات منقطع کر کے اور سب اطاعتوں اور نیاز مندیوں کو ختم کر کے زمین و آسمان کے بنانے والے (ایک خدا) سے رشتہ جوڑ لیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے ہرگز نہیں ہوں۔ گویا کہ اللہ تعالےٰ سے تقرّب و تخاطب اور عرض و معروض تو درکنار اس کے سامنے پیشی کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان بالکل یک سُو ہو کر اور ہر طرف سے کٹ کر آئے اور اپنے آپ کو سرتاپا اور غیر مشروط طور پر اس کی بندگی میں دے دینے کے لیے تیار ہو۔ ہمیں سوچنا یہ ہے کہ آیا خدا کے ساتھ ہمارا تعلق فی الواقع اسی قسم کا ہے اور ہم اس کی ذات، اس کی صفات، اس کے حقوق اور اس کے اختیارات میں اب واقعتہً کسی اَور کو شریک نہیں کر رہے؟ اگر اب تک یہ پہلا قدم بھی دُرست نہیں ہُوا تو ظاہر ہے کہ ایک بے بُنیاد عمارت کی تعمیر میں جان کھپا رہے ہیں اور اس سے بجز تکان کے اور ضیاعِ وقت و محنت کے کچھ حاصل ہونے کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔

تکبیر تحریمہ

نماز میں انسان تکبیر تحریمہ یعنی "اللہ اکبر" کہہ کر داخل ہوتا ہے اور اس کی اہمیّت کی حد یہ ہے کہ اگر یہ کلمہ اَدا نہ ہو تو نماز میں آدمی داخل ہی نہیں ہوتا، اس کا قیام اور قعود، اس کا رکوع اور سجود، اور

اس کی تسبیح اور اس کا درود سب کچھ بے کار اور لاحاصل ہو جاتا ہے۔
یہ کلمہ اس قدر اہم ہے کہ اس کی تجدید اور اس کا اقرار روزانہ کم از کم ایک سو اٹھتر مرتبہ کرایا جاتا ہے۔ اپنی زندگی پر نگاہ ڈالیے اور سوچیے کہ کیا اس ایک کلمہ پر ہی آپ کی زندگی پوری اترتی ہے؟ کیا آپ نے فی الواقع اللہ کے سوا سب کی کبریائی سے انکار اور قطع تعلق کر کے صرف اسی کی کبریائی اور بڑائی کو اعتقاداً، قولاً اور عملاً قبول کر لیا ہے؟ یا اللہ کی کبریائی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی کبریائی بھی چل رہی ہے؟

اَللّٰہُ اَکْبَر کا اقرار کیے بغیر انسان کا نماز میں داخل ہی نہ ہو سکنا اس امر کی صریح دلیل ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بھی کبریائی یا بڑائی دل میں رکھ کر انسان کے لیے اللہ کے دربار میں داخلہ کی کوئی صورت ہی نہیں۔

ذرا آگے چلیے:

ثنَاء

تکبیرِ تحریمہ کے بعد آدمی حسب ذیل الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی ثناء کرتا ہے:

سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ۔

اے میرے مولا! تیری ذات بے عیب ہے، ساری خوبیاں تیرے ہی لیے ہیں۔ تیرا نام برکت والا ہے، تیری شان

نہایت بلند و بالا ہے۔ تیرے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں۔

اب اپنے قلب و دماغ اور فکر و خیال پر ایک بے لاگ نگاہ ڈال کر خود ہی فیصلہ کیجیے کہ:

کیا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ کے اقرار کے بعد آپ کا فی الواقع یہ حال ہو گیا ہے کہ آپ اللہ سے ہر حال میں راضی، اس کے سب کاموں سے مطمئن اور زندگی کے سارے نشیب و فراز میں اس کے صابر و شاکر بندے بن گئے ہیں۔ اور اب اس سے کسی حال میں کبھی کوئی وجہ شکایت پیدا نہیں ہوتی؟ نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی آپ کے نزدیک اب سبحان و بے عیب فقط اسی کی ذات ہے؟

کیا وَبِحَمْدِكَ کے اقرار کے مطابق اب فی الواقع کسی کی بھی خوبی و حسن، قوت و عظمت، قابلیت و ذہانت یا کوئی دوسرا کمال ہمیں اپنی طرف نہیں کھینچ سکتا، بلکہ ان کا دیکھنا ہمیں صاحبِ حسن و کمال کی ذات سے متاثر کرنے کے بجائے ان کے منعم اور معطی ہی کی اطاعت و وفاداری میں بیش از بیش پختہ و استوار کر دیتا ہے؟

کیا وَتَبَارَكَ اسْمُكَ کے اقرار کے بعد فی الواقع تمام زندہ و مردہ آستانہ ہائے عقیدت سے برکات طلب کرنا، یا ان کو ذریعۂ برکات سمجھنا چھوڑ کر صرف اللہ ہی کو ان سب کا واحد سرچشمہ تسلیم کر لیا ہے اور اب فقط اسی کی طرف ان کے لیے رجوع کرتے ہیں؟

کیا وَتَعَالٰى جَدُّكَ کے اقرار کے بعد اب فی الواقع کسی اور کا

تزک واحتشام، جاہ وتمکنت یا کوئی دُوسرا جمال وکمال ہماری آنکھوں کو خیرہ، دلوں کو متاثر یا دماغوں کو مرعوب نہیں کر سکتا اور ہم میں واقعی اتنی جرأت ودلیری اور بے باکی پیدا ہو گئی ہے کہ راہِ حق پر چلتے اور اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہوئے کسی کو خاطر میں نہ لائیں بلکہ دوسروں ہی کو اپنے عزم واستقامت سے مرعوب ومسخر کرتے ہوئے دیوانہ وار آگے بڑھتے چلے جائیں؟

کیا وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ کا عقیدہ جو اسلام کی جان ہے، اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت اور ایک امرِ واقعہ کا اظہار ہے ہمارے رگ وریشہ میں فی الحقیقت اس طرح پیوست ہو گیا ہے کہ ہم نے اپنی پوری زندگی کی بنیاد اب اسی اساس پر قائم کر لی ہے؟ اور حضور نبی کریمؐ کے ارشاد[1] کے مطابق ہماری ساری تگ وتاز اس گھوڑے کی طرح ہو گئی ہے، جو (شریعت الٰہی کی) رسّی کے ساتھ (اطاعت الٰہی کے) کھونٹے سے بندھا ہو۔

---

[1] حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مثل المومن ومثل الایمان کمثل الفرس فی اخیّتہٖ، یجول ثم یرجع الیٰ اخیّتہٖ۔ یعنی مومن اور اس کے ایمان کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہو، وہ چرتا چگتا دَوڑتا بھاگتا ہے لیکن اپنی رسّی کی حد کے اندر۔

تعوّذ

اب تعوّذ کو لیجئے :

اپنی نمازوں میں کم از کم گیارہ مرتبہ روزانہ ہم اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھتے ہیں جس میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ لیکن کیا اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ کے مطابق ہم فی الواقع زندگی کے کسی گوشہ میں بھی شیطان کے آلۂ کار بننے، اس کے پھندے میں پھنسنے اور اس کے وساوس میں مبتلا ہونے سے اللہ کی پناہ کی طرف دوڑتے ہیں ؟

یاد رکھیے کہ انسان ہر اس کام میں جو وہ اپنے رب کے احکام و حدود سے قطع نظر کر کے کسی اور طریقے پر انجام دیتا ہے شیطان ہی کا ایجنٹ بنتا ہے اور اس طریقے کو دنیا میں رائج کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جب تک کسی شخص کے نیک یا بد اعمال کے اثرات دنیا میں موجود و مترتب ہوتے رہتے ہیں اس وقت تک برابر اس کے اعمال نامہ میں یہ نیکی یا بدی لکھی جاتی رہتی ہے۔

سورۂ فاتحہ

تعوذ کے بعد آدمی بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھ کر

سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے۔ جو درجِ ذیل ہے :

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ	تعریف اللہ ہی کے لیے
الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ	ہے جو تمام کائنات کا خالق و
الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ	پروردگار، مالک و فرمانروا اور
الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ	نگہبان ہے۔ رحمان اور رحیم ہے۔
وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝	روزِ جزا کا مالک ہے۔ اے خدا!
اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ	ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں،
صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ	اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں
عَلَيْهِمْ ط غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ	سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں
عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝	کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا،
آمِيْنَ ۝	جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے

ہوئے نہیں ہیں۔ اے خدا! ہماری اس دعا کو قبول فرما۔

اب اس سورہ کی ایک ایک آیت کو لیجیے اور اس میں بار بار کیے جانے والے عہد پر اپنے آپ کو تولتے جائیے۔

کیا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے اقرار کے مطابق آپ نے اپنی زندگی میں ہر قسم کی حمد و ثنا اور تعریف و ستائش فی الواقع صرف اللہ ہی کے لیے مختص کر دی ہے اور ہر مظہرِ جمال و کمال کو دیکھ کر اسی ایک سرچشمۂ جمال و کمال کے سامنے آپ کا سرِ اطاعت اور زیادہ جھک جاتا ہے اور اس کی عبدیت و غلامی میں آپ اور زیادہ پختہ و کامل ہو جاتے ہیں کہ ہر

شے کا بنانے اور عطا کرنے والا اللہ ہی ہے۔

کیا رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ط کا اقرار و عقیدہ ہمارے دل اور دماغ پر، ہمارے کاروبار اور معاملات پر اور ہماری تمام حرکات و سکنات پر فی الواقع اس طرح چھا گیا ہے کہ اب نہ کوئی خوف و ہراس ہمیں راہِ حق سے ہٹا سکتا ہو نہ کوئی دباؤ یا لالچ ہمیں اس راہ سے پھیر سکتا ہو اور نہ کسی ذریعۂ رزق یا ذریعۂ معاش کی وابستگی بالواسطہ یا بلاواسطہ ہی ہمارے راستے میں حائل ہو سکتی ہو بلکہ ہماری پوری کی پوری زندگی قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا[1] (الم: ۳۰) کا حقیقی مظہر بن گئی ہو اور ہم اپنے اس عقیدے اور نصب العین پر مردانہ وار ڈٹ گئے ہوں کہ جب اللہ ہی رب العٰلمین اور ہم سب کا رب ہے، سب اسی کے محتاج ہیں، اسی نے سب کچھ پیدا کیا، وہی پرورش کر رہا ہے، وہی نفع اور نقصان کا مالک ہے تو آخر اسے چھوڑ کر دوسرے کسی الٰہ باطل کی نیازمندی، اطاعت یا غلامی ہم کس طرح اور کس لیے کریں؟ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِیًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ یُطْعِمُ وَ لَا یُطْعَمُ (الانعام: ۱۴) اَیُشْرِكُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْئًا وَّهُمْ یُخْلَقُوْنَ وَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَا اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ۔ (الاعراف: ۱۹۱-۱۹۲)۔

---

[1] جنہوں نے کہا کہ ہمارا خالق و مالک اور روزی رساں اللہ ہی ہے اور پھر اپنی اس بات پر ڈٹ گئے۔

"کیا میں زمین و آسمان کے خالق خدا کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا ولی و سرپرست بنا لوں؟ حالانکہ وہی (ایک ایسا الٰہ) ہے جو روزی دیتا ہے اور روزی لیتا نہیں ہے۔ کیسے نادان ہیں وہ لوگ جو ان کو خدا کا شریک ٹھیراتے ہیں جو کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں اور جو اپنے پرستاروں کی مدد تو کیا کریں گے خود اپنی مدد پر بھی قادر نہیں ہیں؟"

ظاہر ہے کہ اللہ رب العلمین کے سوا جو جو بھی اپنی خدائی، حکومت اور معبودیت کے دعویدار ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر انسانوں نے جن جن کو بھی اپنا خدا، حاکم اور مطاع و معبود بنا رکھا ہے وہ سب اپنے بندوں کو رزق دینے کے بجائے اُلٹا ان سے رزق پانے کے محتاج ہیں، کوئی بادشاہ اور حکمران خواہ وہ فرعون اور نمرود ہی کا سا دبدبہ اور اقتدار کیوں نہ رکھتا ہو اپنی خدائی اور حاکمیت کا ٹھاٹھ جما نہیں سکتا جب تک کہ اس کے بندے اسے ٹیکس اور نذرانے نہ دیں اور وقت پڑے پر اس کی فوج میں بھرتی ہو کر اسے اس کے دشمنوں سے نہ بچائیں۔ کسی صاحبِ قبر کی شانِ معبودیت قائم نہیں ہو سکتی جب تک اس کے پرستار اس کا مقبرہ تعمیر کر کے نذریں اور نیازیں چڑھانا اور منّتیں ماننا نہ شروع کریں۔ کسی دیوی دیوتا کا دربار سج نہیں سکتا جب تک اُس کے پجاری اس کا مجسمہ بنا کر کسی عالیشان مندر میں نصب نہ کر دیں اور ہر قسم کے قصّے اور کہانیاں گھڑ کر جاہل لوگوں میں نہ پھیلا دیں۔ سارے بناوٹی خدا بے چارے خود اپنے بندوں کے محتاج

ہیں۔ صرف ایک خداوندِ عالم ہی وہ حقیقی خدا ہے جس کی خدائی آپ اپنے بل بوتے پر قائم ہے اور جو کسی کی مدد کا محتاج نہیں بلکہ سب اسی کے محتاج ہیں۔

کیا اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی حقیقت ہم نے اپنی ہی زندگی میں نہیں بلکہ زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ہر شے میں پوری طرح محسوس کر لی ہے کہ ہمارے رب کی ربوبیّت، اس کی فیاضی اور مہربانی اور اس کی رحمت کس قدر ہمہ گیر، کس قدر وسیع، کتنی مسلسل اور کبھی نہ ختم ہونے والی ہے؟ اور اس نے کس کمال تسلسل کے ساتھ ہماری اور اس کائنات کی دوسری بے حد و حساب مخلوق کی تمام محسوس و غیر محسوس ضروریات کو پورا کرنے کا انتظام کر دیا ہے اور بے دریغ کیے چلا جا رہا ہے، قطع نظر اس کے کہ کوئی اس کی اطاعت یا نافرمانی کرے یا اس کی ہستی کا سرے سے انکار کر دے۔ کیا اس احساس کی کوئی شہادت ہماری زندگی اور اس کے مشاغل میں موجود ہے؟ کیا ہماری زندگی کا کوئی گوشہ اور اس کے چوبیس گھنٹوں میں سے کوئی لمحہ بھی اب ایسا نہیں رہا جس میں ہم اپنے رب کی اطاعت و بندگی اور نوکری سے باہر ہوتے ہوں؟ جب اس کی ربوبیّت اور رحمت ہمہ گیر اور مسلسل ہے تو بندوں کی بندگی محدود اور وقتی ہونے کے کیا معنیٰ؟ کیا اس کی تمام مخلوق کے ساتھ ہمارے تمام تعلقات ٹھیک وہی اور اسی طرح کے ہیں جو رب العٰلمین نے مقرر کیے ہیں اور ظلم و شرک، جبر و تعدی، طغیان و سرکشی اور فتنہ و فساد جیسے سب فواحش ہماری زندگی سے کلیتہً

خارج ہو گئے ہیں کیا اب ہم اسی احساس و ادراک کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں کہ اس رب رحمٰن و رحیم کی بے پایاں رحمت کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کی مخلوق میں سے کسی کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ حق تلفی یا ان میں سے کسی پر کوئی چھوٹے سے چھوٹا ظلم و تعدّی بھی ہو اور وہ اس کا سولہ آنے عدل و انصاف نہ فرمائے۔ لازم ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی دادخواہی کے لیے بے لاگ انصاف کا ایک دن مقرر کرے جہاں ہر شخص اپنی ایک ایک ذرّہ نیکی اور بدی کا ٹھیک ٹھیک بدلہ پالے۔ عقل کا فیصلہ یہی ہے۔ رحمت کا تقاضا یہی ہے اور اخلاق کا مطالبہ بھی یہی ہے کہ ابراہیمؑ اور نمرود، ابوبکرؓ اور ابوجہل اور ظالم و مظلوم کا انجام ایک نہیں ہونا چاہیے۔

چنانچہ اسی تقاضے کے جواب میں (مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ) کے ذریعے اطمینان دلایا گیا، اسی امر کی وضاحت لَا يَسْتَوِيْ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ میں کی گئی کہ اہلِ دوزخ اور اہل جنّت کسی طرح برابر نہیں کیے جا سکتے اور اسی امر کی صراحت دُوسری جگہ حسبِ ذیل طریقوں پر فرمائی گئی:

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ
اَمْ نَجْعَلِ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ
(صٓ : ۲۸)

کیا ہم ایمان لانے والوں اور نیک کام کرنے والوں کو انہی جیسا بنا دیں گے جو زمین میں فساد کرتے ہیں؟ کیا ہم متقیوں اور فاجروں کو یکساں کر دیں گے؟

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ۔ (الجاثیہ : ۲۱)	کیا بدکاریاں کرنے والے یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو ایمان لانے والوں اور نیک کام کرنے والوں کے برابر کر دیں گے اور ان کی زندگی اور موت یکساں ہوگی؟ یہ کیسی بری بات ہے جس کا وہ حکم لگاتے ہیں۔

بلکہ :-

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا۔ (الانعام)	ہر ایک کے لیے ویسے ہی درجات ہوں گے جیسے انہوں نے عمل کیے۔

اور پھر :-

کیا مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ کے اقرار کے بعد اب ہمارے تمام معاملات اور ہماری زندگی کے سارے مسائل (انفرادی، اجتماعی اور خاندانی، معاشی، معاشرتی اور تمدّنی، قومی اور ملّی اور سیاسی، سب کے سب) اسی اقرار اور عقیدے کے مطابق انجام پا رہے ہیں کہ ایک روز ہمیں ایک ایک پائی، ایک ایک حرکت اور ایک ایک لمحہ کا اپنے عالم الغیب والشّہادۃ اور علیمٌ بِذَاتِ الصُّدُور خدا کو حساب دینا ہے۔ کیا خدا کے حقوق، والدین، بیوی اور اولاد کے حقوق، پڑوس، سوسائٹی اور دوسری مخلوق خدا کے حقوق

ٹھیک ٹھیک اور اسی طرح ادا کیے جا رہے ہیں جس طرح اللہ اور اُس کے رسولؐ نے مقرر کیے ہیں۔ کیا آپ کے سارے معاملات ایسے ہیں کہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے روبرو "فوزِ عظیم" پانے والے نہ سہی، کم سے کم اس کی سزا اور اس کے عتاب ہی سے بچ جائیں۔

یہ یاد رہے کہ خالق کے حقوق اپنی مخلوق پر باقی سب حقوق سے بڑھ کر ہیں اور اس کا حق یہ ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی اس کی اطاعت میں دیدیں اور اس کا کلمہ بلند کرنے اور زمین پر اس کے منشاء اور مرضی کو عملاً نافذ کرنے کیلئے اپنا سب کچھ لگا دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کا فی نفسہٖ ہم پر سرے سے کوئی حق ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی نے ان لوگوں کے کچھ حقوق ہمارے ذمے لگا دیئے ہیں جن کو اس نے ہماری پیدائش، پرورش اور اجتماعی زندگی کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے اور ان حقوق کی ادائیگی دراصل اللہ ہی کی اطاعت میں داخل ہے۔ اسی لیے اگر وہ کسی ایسی چیز کا حکم دیں جو منشاء الٰہی کے خلاف ہو تو نہ صرف یہ کہ اس حکم کی تعمیل ضروری نہیں بلکہ اگر تعمیل کی جائے گی تو اللہ تعالیٰ کے ہاں گرفت ہو گی اور سزا دی جائے گی۔ بندوں کا جو مطالبہ خدا کے حق یا اس کے کسی حکم سے ٹکرائے گا رَد کر دیا جائیگا، خواہ وہ مطالبہ ماں باپ کا ہو، برادری کا ہو یا کسی دوسری بڑی سے بڑی طاقت کا۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے الفاظ میں جو ہم اللہ تعالیٰ کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہماری عبادت و غلامی اور اطاعت و فرمانبرداری

بس تیرے ہی لیے ہے، ہماری تمناؤں، امیدوں اور آرزوؤں کا سہارا بس تو ہی ہے، اور ان مشکلات و مصائب میں جو تیری اطاعت و غلامی کی راہ میں پیش آتی ہیں بس تیری ہی امداد و اعانت طلب کرتے ہیں، کیا اس کا کوئی ثبوت ہماری روزانہ زندگی، اس کے معاملات، ہمارے طرزِ عمل اور ہماری روز کی دوڑ دھوپ سے بھی ملتا ہے؟ یا پھر اطاعت و فرمانبرداری اور غلامی و عبادت تو کسی اور کی ہو رہی ہے اور اس بندگیٔ غیر اللہ میں امداد و اعانت اللہ سے طلب کی جا رہی ہے۔ گویا کہ وہ کفر و بغاوت اور طغیان و سرکشی کے اور زیادہ مواقع اور سہولتیں عطا فرمائے!

کیا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی التجا کرتے وقت صراطِ مستقیم پر چلنے کا واقعی کوئی ارادہ و خیال یا سنجیدہ تمنا ہی موجود ہوتی ہے؟ کیا آپ کی زندگی اور اس کے مشاغل میں اس کا کوئی ثبوت موجود ہے کہ آپ فی الواقع اس راہ کے متلاشی ہیں؟ کیا آپ کی قوت و قابلیت، فکر و خیال، جان و مال یا وقت کا کچھ حصہ بھی اس کی تلاش میں صرف ہو رہا ہے؟ جو تھوڑی بہت اور جس قدر معلومات اس بارے میں حاصل ہیں کیا ان کے مطابق کوئی قدم اٹھا رہے ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے بلکہ اپنے تمام ذرائع و وسائل اور ساری قوتوں کو "صراط النفس والطاغوت" میں لگا رکھا ہے، ایک کافرانہ نظام کی گاڑی میں پوری خوشدلی اور اطمینان سے سوار ہیں، اس گاڑی کا بیل بننا آپ کی نظر میں دنیا جہان کی سعادتوں کے حصول کا ہم معنی ہے اور اپنے عقل و دماغ تک کو اسی گاڑی کو چلانے

اور اس کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے وقف کر رکھا ہے تو کیا اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کے ذریعے اللہ سے اب یہ چاہا جا رہا ہے کہ اپنے سب ضابطوں کو توڑ کر، آپ کے سب اختیارات کو سلب کر کے اور اینٹ پتھر کی طرح مجبور محض بنا کر اپنی راہ پر ڈال دے؟

اس بارے میں یہ اچھی طرح سے جان لینا چاہیے کہ دین و ہدایت کے بارے میں اللہ کا قانون جبر و اکراہ سے کام لینا نہیں ہے (لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ[1]) بلکہ اس نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیئے ہیں (وَ ھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ[2]) اور اسے پورا اختیار دے دیا ہے کہ اپنے لیے ہدایت اور فلاح کے راستے کو پسند کرے یا گمراہی اور بغاوت کی راہ اختیار کرے (فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ[3]) بہر حال انسان کو اپنی کوشش ہی کا ثمرہ ملے گا (لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی[4]) اور اگر وہ اس معاملے میں سخت کوشی سے کام لے اور اس کے لیے کوئی چوٹ کھانے کے لیے تیار ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے صراطِ مستقیم کھول دیتے ہیں۔ (وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا[5])

ظاہر ہے کہ کراچی کا کوئی مسافر لاہور سے پشاور کی طرف جانے والی

---

[1] البقرہ : ۲۵۶
[2] البلد ۹۰ : ۱۰
[3] الکہف : ۲۹
[4] النجم ۵۳ : ۳۹
[5] العنکبوت : ۶۹

گاڑی میں سوار ہو کر خواہ لاکھوں سجدے کرے، دن رات مراقبے میں گزار دے، اور جتنی چاہے کراچی پہنچنے کی دُعائیں اور التجائیں کرتا رہے بہر حال پشاور ہی پہنچ کر رہے گا۔ اور اگر راستے میں گرد و پیش اور ملک کے جغرافیہ سے ناواقفیت کی بنا پر وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا تھا تو سٹیشن پر پہنچتے ہی اسے معلوم ہو جائے گا کہ وہ تو اپنی منزل سے کہیں زیادہ دُور ہو گیا اور یہ غلطی خواہ اس نے کتنی نیک نیّتی اور دیانت داری سے کی ہو، نتیجے کے لحاظ سے بہر حال کوئی فرق نہیں ہو گا۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی بالکل برعکس ہے کہ غیر اللہ کی گاڑی کو غیر اللہ کی گاڑی جانتے ہوئے اور زبانوں سے اس کا اقرار کرتے ہوئے اس میں سوار ہیں، اس کے بَیل بنے ہیں اور اس کے کَل پُرزے بنانے میں مصروف ہیں اور اس کے لیے تیل مہیّا کرنے کے لیے خون پسینہ ایک کر رہے ہیں، اپنی ساری تمنّائیں اس کے ساتھ وابستہ کیے ہوئے اور زبان سے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کا وِرد بھی جاری ہے! حماقت اور بے عقلی کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ اگر فی الواقع صراط مستقیم پر چلنے کی کوئی تمنّا ہے تو اس گاڑی سے اُتریئے، اس کو چلانے کے بجائے اس پر بریک لگانے کی فکر کیجئے۔ اس کے چلانے والوں کو سیدھی راہ کی طرف بُلایئے۔ وہ نہ مانیں تو دوسری سواریوں کو اس گاڑی کی منزل سے آگاہ کر کے ان کو اپنا ہم خیال بنایئے تاکہ اُن کی اجتماعی قوّت سے گاڑی پر قبضہ کر کے اسے صحیح سمت میں چلایا جا سکے۔ اور اگر اس

کا بھی امکان نہ ہو تو پھر جو تھوڑے بہت ہم خیال لوگ ملیں ان کو ساتھ لے کر اس گاڑی سے الگ ہو جائیے تاکہ اگر اپنی منزل کی طرف بڑھنے کی قدرت اور وسائل میسّر نہیں ہیں تو کم سے کم اس منزل سے اور دُور تو نہ ہو جائیں۔ اس راہ کو اختیار کر کے اپنے رب سے راہِ راست کی ہدایت اور اس پر چلنے کی توفیق مانگیے اور پھر انشاء اللہ وہ یہ راہ دکھا بھی دے گا اور اس پر چلنے کی توفیق بھی عطا فرما دے گا۔

کیا صراطِ مستقیم کی صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کی تصریح کے ساتھ "مغضوب" اور "ضالّین" کی راہوں کو فی الواقع چھوڑ کر ان لوگوں کی راہ پر عملاً چل پڑے ہیں جن پر اللہ کا انعام ہوا؟ یا پھر اسلام کے بجائے اس کے صریحاً خلاف راہوں پر چل کر سودی بنک، انشورنس کمپنیاں، فحاشی کے اڈے قائم کر کے، اللہ سے بغاوت اور سرکشی کو اپنا شعار بنا کر، اس کے قانون کو ٹھکرا کر، اس کے دین کو ناممکن العمل قرار دے کر اور اپنے دل و دماغ، ہاتھ پاؤں اور جان و مال کی قوتیں غیر اللہ کے ہاتھ فروخت کر کے اور کرایہ پر چڑھا کر، ان کلمات کے ذریعے معاذ اللہ اپنے رب سے مذاق اور تمسخر کرنا مقصود ہے کہ اگر تیرا زور چلتا ہے تو خود اپنے زور سے ہمیں اُس راہ سے ہٹا کر ان لوگوں کی راہ پر چلا دے جو تجھے پسند اور تیرے انعام کے مستحق ہیں؟

سورۂ اخلاص

سورۂ فاتحہ کے بعد نماز میں قرآن مجید کی کوئی دُوسری سورہ یا اس کا کوئی حصّہ پڑھا جاتا ہے۔ جن آیات کو بھی آدمی پڑھے ان کو سامنے رکھتے ہوئے اسے غور کرنا چاہیے کہ آیا اس کا عملی طرزِ عمل ان آیات کے مطالب سے مطابقت رکھتا ہے؟ اگر ان کے مطابق نہیں یا ان سے ہٹا ہُوا ہے تو اسے ان کے ٹھیک مطابق کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ ورنہ قیامت کے روز اس کی تلاوت کردہ یہی آیات اس کے خلاف حجّت بن کر آ کھڑی ہوں گی۔

لیکن چونکہ عام مسلمان زیادہ تر سورۂ اخلاص ہی سے کام چلاتے ہیں۔ اس لیے یہاں تفصیلی تذکرہ صرف اسی کا کیا جاتا ہے۔ فرمایا:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ

"لوگوں کو بتا دو کہ وہ اللہ (جس کی طرف تمہیں بلایا جا رہا ہے) ایک ہے۔ اسے کسی کی حاجت نہیں، دوسرے سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ باپ۔ اور نہ ہی کوئی اس کا ہمسر ہے۔"

اب اس تصوّرِ باری تعالیٰ کو سامنے رکھیے اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی زندگی اور اس کے معاملات کا جائزہ لیجیے کہ یہ سب کہاں تک

اللہ تعالیٰ کے بارے میں ان آیات میں مذکور عقیدے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ان آیات میں غیر مبہم الفاظ میں بتا دیا گیا ہے کہ ایک اللہ کے سوا نہ کوئی دُوسرا خدا ہے کہ اس سے بھاگ کر اس دوسرے خدا کی مملکت میں جا پناہ لو۔ نہ اسے تم سے یا کسی دوسرے سے کوئی حاجت ہے کہ وہ دَبنے یا اس کا لحاظ کرنے پر مجبور ہو۔ نہ اس کا کوئی بیٹا یا باپ ہے جو مچل کر یا اپنی پدرانہ بزرگی اور زور سے اپنی بات منوا لے۔ اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر ہی ہے جس کی مروّت میں آکر وہ کسی کی ناجائز رعایت پر مجبور ہو جائے۔ لہٰذا خوب جان لو کہ اس کے ہاں بالکل بے لاگ انصاف ہوگا۔ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔ جو ذرّہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ اسے پالے گا اور جو ذرّہ برابر بھی برائی کرے گا اسے پالے گا۔

رکوع، قومہ اور سجدہ

اس کے بعد آدمی رکوع میں جاتا ہے اور بار بار سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمُ کا وِرد کرتا ہے۔ پھر سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ کہتا ہوا کھڑا ہو جاتا ہے اور رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کہہ کر سجدہ میں جا گرتا ہے — اور سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى کا وِرد شروع کر دیتا ہے۔

کیا سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمُ اور سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى (تمام عیبوں سے پاک ہے میرا سب سے بلند اور صاحبِ عظمت رَب) کے اقرار کے

بعد آپ اپنے رب کی تقسیم رزق اور اس کی مقرر کردہ تقدیر پر شاکی یا غیر مطمئن تو نہیں ہیں کہ تنگی و تکلیف میں مایوس و کفور ہو جاتے ہیں اور نعمت و قوت پاکر متکبر اور ناشکرے بن جاتے ہوں، بلکہ ہر حال میں اپنے رب کی بندگی کی راہ پر مضبوطی سے قدم جمائے صبر و استقلال کے ساتھ آگے ہی آگے بڑھتے چلے جارہے ہیں اور یہ سمجھ لیا ہے کہ ہمارے رب نے جو اور جس قدر مناسب سمجھا وسائلِ زندگی میں سے عطا فرما دیا، اب اسی میں ہماری امانت و دیانت، وفاداری اور احسان مندی کا امتحان ہے۔ مزید برآں نہ تو اب اپنے اس رب عظیم و برتر کے علاوہ کسی اور زندہ یا مردہ الٰہ کو ایسا سمجھتے ہیں کہ وہ بھی اگر چاہے تو ہماری تقدیر یا رزق میں کوئی کمی یا اضافہ کرسکتا ہے اور نہ ہی اپنے رب عظیم و سبوح کی حدود کو پھاند کر دوسری راہوں سے اپنے رزق میں اضافہ کے متمنی ہوتے ہیں۔

کیا سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ کے انکشاف اور اس کے اقرار کے بعد ہمیں فی الواقع اپنے معبود حقیقی اور الٰہ واحد سے اپنے براہِ راست اور نہایت قریبی تعلق اور اس تک بلا روک ٹوک اور فوری پہنچ کا علم و ادراک ہو گیا ہے کہ اس تک پہنچنے کے لیے کسی درمیانی واسطے، وسیلے یا سفارش کی ضرورت نہیں بلکہ اس کا ہر بندہ ہر وقت اور ہر حال میں اس سے براہِ راست مخاطب ہو سکتا ہے اور اپنی ہر قسم کی معروضات اور حمد و ثنا اس کے حضور پیش کر سکتا ہے۔ اس کے ہاں کوئی سیکرٹری، مصاحب، چپراسی یا دربان

کسی وقت بھی کسی سائل کو روکنے والا نہیں ہے۔

کیا رَبَّنَا لَكَ الْحَمْد کہنے کے بعد اب فی الواقع کسی اور کی ربوبیت اور حمد وثنا کے لیے دل میں جگہ نہیں رہی اور اپنے رَب کی ہمہ گیر ربوبیت اور نگہبانی کا کما حقہٗ احساس ہوگیا ہے؟

اَلتَّحِیَّات

اب اَلتَّحِیَّات کو لیجئے جو آدمی اپنے رَب کے حضور دوزانو بیٹھ کر گزارش کرتا ہے:

اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّیِّبَاتُ ، اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَكَاتُهٗ ۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ ۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ۔

"میری زبان، میرے جسم وجان اور میرے سارے مال و منال سب اللہ کے لیے وقف ہیں۔ اے نبیؐ! اللہ کی طرف سے آپ پر سلام ورحمت ہو، وہ آپ کو اپنی برکات سے نوازے۔ ہم پر بھی اللہ کی طرف سے سلامتی ہو اور اللہ کے تمام نیک بندوں پر اس کی سلامتی ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور میں یہ بھی گواہی دیتا

ہوں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے
اور اس کے رسول ہیں"۔

اپنے اس اقرار کو سامنے رکھ کر ذرا بتائیے کہ:

کیا اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّیِّبَاتُ کے بیان واقرار میں کچھ بھی صداقت ہے؟ اور واقعی آپ کی زبان اور جان ومال کی سب قوتیں اللہ کے لیے وقف ہو چکی ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے اور سب کچھ نہیں تو بہت کچھ نہ صرف یہ کہ اللہ کے لیے نہیں بلکہ اس کے برعکس کلمۂ کفر کی سربلندی اور خدا کے نافرمانوں کی خوشنودی کے لیے وقف ہے تو پھر اس عالم الغیب والشہادۃ سے بار بار یہ جھوٹا اقرار، یہ غلط بیانی اور دھوکا دہی کی یہ کوشش آخر کیا گُل کھلائے گی؟ اور اس طرزِ عمل اور جان ومال کے ان مصارف کے ساتھ اس علیم وخبیر خدا کو یہ جھوٹا یقین دلانے کی کوشش کرنا کہ دراصل تو ہمارا سب کچھ تیری ہی خدمت وخوشنودی کے لیے وقف ہے اس کے غضب اور غصّہ کو کس قدر بھڑکائے گا؟ اور پھر اس حال میں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ مذاق کرتے ہوئے ہمارے اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ کے خطاب سے محبوبِ خدا سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ مقدّس کو کوئی مسرّت ہوتی ہوگی یا کوفت وبیزاری؟ کیا یہ سلام اس شخص کے سلام کا سا نہیں ہے جو اپنی ساری قوّتیں اور وسائل تو اپنے آقا کے مقابلے میں لگا دیتا ہے، اس کے خلاف کھڑی ہونے والی ہر طاقت

کا ممد و معاون بن جاتا ہے، اور اس سے سرکشی و بغاوت کرنے والوں کی ہر ضرورت میں کام آنے کے لیے تیار رہتا ہے مگر جب رُوبرُو جاتا ہے تو نہایت بزدلی اور مکاری سے دست بستہ عرض کر دیتا ہے: "حضور! غلام آداب بجالاتا ہے۔ خادم تو حضور کی عزّت و اقبال مندی کے لیے ہر آن دُعاگو ہے، نمک خوار کے پاس تو سب کچھ حضور ہی کا عطیّہ اور حضور ہی پر نثار ہے۔" کیا اس سلام کا زخم بھی کبھی مندمل ہو سکتا ہے۔ چہ جائیکہ مالک کے ہاں سے کسی انعام و تقرّب کی امید کی جا سکے یا اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ کی دعا اس کے دریائے رحمت میں ذرا سا تموّج بھی پیدا کر سکے؟

پھر کیا اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کے روزانہ کئی کئی بار کے عہد و شہادت کے بعد اب واقعی زندگی کے کسی گوشہ اور کسی معاملہ میں بھی کسی اَور کو الٰہ تسلیم نہیں کیا جاتا؟ اور اللہ ہی کی حدود اب آپ کی زندگی کی رہبر و رہنما ہیں کہ بس اسی کا حکم آپ کے لیے حکم، اسی کا حلال آپ کے لیے حلال، اسی کا حرام آپ کے لیے حرام، اسی کا قانون آپ کے لیے قانون، اسی کی پسند آپ کی پسند، اسی کی خوشی آپ کی خوشی اور اسی کی مقرر کردہ راہ حیات آپ کی راہ ہو، حتّٰی کہ اسی کا دوست آپ کا دوست اور اسی کا دشمن آپ کا دشمن ہو، قطع نظر اس کے کہ خون و نسل سے وہ آپ کا بھائی، باپ، بیٹا یا کوئی دوسرا عزیز ہو۔

اور کیا اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ کے بار بار

کے عہد و اقرار اور شہادت کے بعد اب آپ نے فی الواقع تمام دوسری رہنمایوں، قیادتوں، ہدائتوں اور لیڈر شپوں کو کلیتہً چھوڑ کر اپنی زندگی کے ہر گوشے اور ہر مرحلے اور ہر معاملے میں ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی رہنمائی، قیادت، ہدایت اور لیڈر شپ کو عملاً اختیار کر لیا ہے۔ اور اب پوری کی پوری زندگی انہیں کی قیادت اور رہنمائی میں بسر ہو رہی ہے؟ یا پھر زبان سے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت قبول کر رکھی ہے اور اصطلاحی عبادت کی ظاہری شکل کے سوا باقی ساری زندگی یا اس کے بیشتر معاملات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ کوئی دخل حاصل نہیں؟

اور پھر کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو آپ نے اپنے عقیدہ اور عمل میں فی الواقع ٹھیک اسی مرتبہ اور مقام پر رکھا ہے جس کا اپنی ہر نماز میں بار بار اعلان اور اقرار کرتے ہیں؟ کہ نہ تو نعوذ باللہ آپ کو مقامِ نبوّت سے نیچے گرا کر ایک عام دُنیوی لیڈر، کمانڈر یا مصلح کی حیثیت دے دی ہو جسے ہر شخص چاہے تو اپنی کوشش اور کسب و ریاضت سے حاصل کر سکتا ہو۔ اور نہ آپؐ کو مقامِ نبوّت سے اُوپر لے جا کر خدا کا ہم پلّہ بنا دیا ہو کہ عام آدمی آپؐ کے عملی اتباع کو ویسے ہی اپنے لیے ناممکن العمل اور اس وجہ سے غیر ضروری سمجھنے لگ جائے۔ خوب جانچ کر دیکھیے۔ کیا آپ نے اپنے عقیدہ اور عمل میں فی الواقع حضورؐ کی "عبد" اور "رسول" ہونے کی دونوں حیثیتوں میں ٹھیک توازن قائم رکھا ہے؟

درُود شریف پڑھنے کا تقاضہ

"التحیّات" کے بعد سلام پھیرنے سے پہلے ہم یہ درُود شریف پڑھتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ
وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ
وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝

یعنی اے اللہ! محمدؐ اور ان کے ماننے والوں پر رحمت فرما۔ جس طرح کہ آپ نے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ماننے والوں پر رحمت فرمائی۔ بے شک آپ انتہائی قابلِ تعریف اور بزرگ و برتر ہیں۔ اے اللہ! محمدؐ اور ان کے ماننے والوں کو برکت و اقبال عطا فرما جس طرح کہ آپ نے ابراہیمؑ اور ان کے ماننے والوں کو برکت و اقبال عطا فرمایا۔ حقیقت میں ایک آپ ہی قابلِ تعریف اور بزرگ و برتر ہیں۔

اب اپنے اس درود و سلام کو سامنے رکھ کر بتائیے کہ جس محمدؐ اور اس کے نام لیواؤں تک کے لیے آپ کے یہ جذبات ہیں کہ رات

دن ان کے لیے خیر و برکت اور ترقّی و سربلندی کی اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ اور اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ پڑھ پڑھ کر دُعائیں کرتے ہو؟ کیا ان کے مقصد و مشن کی سربلندی کے لیے کوئی عملی قدم بھی اُٹھا رہے ہو؟ کیا آپ کا دل حقیقت میں ان دعاؤں کے ساتھ ہے؟ کیا آپ کی روزانہ زندگی اور اس کے مشاغل، آپ کی مصروفیّتیں اور سعی و جہد اور آپ کے جان و مال کا صرفہ انہی دُعاؤں اور اسی مقصد کی تکمیل کے لیے ہے؟ یا پھر حقیقت یہ ہے کہ بغل میں چھُری اور مُنہ میں رام رام کی کیفیّت ہے کہ اپنی سب قوّتیں اور وسائل تو دینِ محمدؐ کو سرنگوں اور دینِ طاغوت کو سربلند کرنے میں لگا رکھے ہیں اور زبان پر دُعاء و درُود جاری ہے؟ صاحبو! مذاق اور ڈھٹائی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔ سوچ سمجھ کر چلیے، معاملہ کس سے ہے؟ ذرا خیال فرمائیے کہ ان حالات میں بھیجا ہُوا درُود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے کس قدر اذیّت کا موجب ہو رہا ہو گا؟ عملی زندگی اور دَوڑ دھوپ سے قطع نظر چند منتروں کو جَپ لینا یا کچھ اَوراد کی رَٹ لگا لینا اینٹ، پتّھر سے گھڑے ہوئے دیوتاؤں کو تو ممکن ہے خوش کر دے مگر اس علیم و بصیر خدا اور اس کے رسول کے ہاں تو اس کی رسائی کی کوئی صُورت نہیں ہے۔

اور پھر:

رات کی تنہائیوں میں جو اقرارِ عبودیت کرتے ہیں؛

دن بھر کے مشاغل سے فارغ ہو کر، رات کی تنہائی میں اللہ کے حضور دست بستہ کھڑے ہو کر وترِ کی قنوت میں جس عہد نامہ کی تجدید روزانہ اس قدر یکسوئی کے ساتھ کی جاتی ہے ذرا اس کی روشنی میں بھی اپنے کردار واعمال کا جائزہ لیجئے اور سوچیے کہ قول و فعل کے اس تناقض کا نتیجہ آخر کار کیا ہو گا؟ اس غلط فہمی کو دل سے دُور کیجئے کہ عملی زندگی سے قطع نظر چند الفاظ کے "تلفظ" سے کوئی اجر و ثواب مترتب ہوتا رہیگا۔ اپنے روزانہ مشاغل کو دعائے قنوت کے ایک ایک جملے پر پرکھ کر دیکھیے۔

دُعاءِ قنوت

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُکَ وَ نَسْتَغْفِرُکَ وَ نُؤْمِنُ بِکَ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْکَ وَ نُثْنِیْ عَلَیْکَ الْخَیْرَ۔ وَ نَشْکُرُکَ وَلَا نَکْفُرُکَ وَ نَخْلَعُ وَ نَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ۔ اَللّٰھُمَّ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَلَکَ نُصَلِّیْ وَ نَسْجُدُ وَ اِلَیْکَ نَسْعٰی وَ نَحْفِدُ وَ نَرْجُوْا رَحْمَتَکَ وَ نَخْشٰی عَذَابَکَ۔ اِنَّ عَذَابَکَ بِالْکُفَّارِ مُلْحِقٌ۔

یعنی اے اللہ! ہم تیری مدد چاہتے ہیں۔ تیری بخشش کے طلبگار ہیں۔ صدقِ دل سے تجھے اپنا خدا تسلیم کرتے ہیں۔ تو ہی ہمارا سہارا اور تجھی پر ہمارا بھروسہ ہے۔ ہم تیری بہترین ثنا کرتے ہیں۔ ہم تیرا شکر ادا کرتے ہیں۔ تیری ناشکری و نافرمانی نہیں کرتے (تیری نافرمانی تو درکنار) تیرے نافرمانوں سے ہم دُور بھاگتے اور اُن سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ اے اللہ! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تیرے ہی آگے جُھکتے اور سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ ہماری تمام سعی و جہد تیرے لیے ہے۔ ہم تیری خدمت کے لیے حاضر اور اسی میں سرگرمِ عمل ہیں۔ ہم تیری رحمت کے امیدوار اور تیری گرفت سے لرزہ براندام ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تیرا عذاب تیرے نافرمانوں کے سر پر لٹک رہا ہے۔

اب اس دعا کو سامنے رکھ کر بتلایئے کہ جب آپ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُکَ کہتے ہیں تو اس استدعا کے وقت کونسے اُمور، کیا تمنّائیں اور آرزوئیں اور کن مقاصد کے حصول کی راہ کی رُکاوٹیں سامنے ہوتی ہیں؟ کیا اللہ کی اطاعت؟ اس کے رسول کا اتباع؟ اس کے دین کی سربلندی؟ اس کی راہ میں استقامت؟ اس کے باغیوں سے کشمکش؟ دینِ حق کا غلبہ اور دینِ طاغوت کا استیصال؟ یا صرف خواہشاتِ نفس کا حصول، نظامِ کفر میں روز افزوں پذیرائی، اس کے کارندوں میں اعزاز

اور اللہ کے باغیوں میں ناموری! اگر اکثر نہیں بلکہ ننانوے فی صد دعاؤں میں یہ دوسری ہی چیزیں مقصود و مطلوب ہوتی ہیں تو خدارا بتایئے کیا اللہ کی گرفت اور اس کے غضب سے اس قدر مامون ہو گئے ہو کہ اس طرح اس سے استہزاء پر اُتر آؤ اور اس سے بغاوت و سرکشی کے کاموں میں کامیابی کے لیے بھی اسی سے دعائیں مانگو؟ خوب جان رکھو کہ وہ بڑا صاحبِ غیرت اور قوی عزیز ہے۔ جب اس کی گرفت کا وقت آ گیا تو ایک سانس کی بھی مہلت نہیں دی جائے گی۔ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ[1] إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ۔

ہاں اس وقتِ معیّن تک کھلی چھٹی ہے کہ جو چاہو کرو۔

کیا آپ کی وَنَسْتَغْفِرُكَ کی دعا فی الواقع إِذْ فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ..... وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ[2] (آل عمران۔ ۱۳۵) کے موجباتِ عفو سے کچھ بھی مطابقت رکھتی ہے؟ کہ اصلاً تو آپ نے

---

[1] ہر گروہ کے لیے مہلت کی ایک مدّت مقرّر ہے۔ پھر جب کسی قوم کی مدّت آن پُوری ہوتی ہے تو ایک لمحہ کی تاخیر و تقدیم نہیں ہوتی۔ (الاعراف: ۳۴)

[2] اگر کبھی کوئی بُرا کام اُن سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انہیں یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں.... اور وہ جان بوجھ کر اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔

اللہ ہی کی اطاعت اور اس کے رسُول ہی کے اتباع کو اپنی پُوری زندگی کا شیوہ بنالیا ہے اور زندگی کے سب منازل و مراحل اور نشیب و فراز میں اسی کے دین اور اسی کے حدود کی پابندی کرتے ہیں۔ خدا کی نافرمانی سے بچنے کی امکانی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر بشری کمزوری یا غلبۂ نفس کی بنا پر کبھی کبھار کوئی لغزش ہوجاتی ہے تو علم ہوتے ہی فوراً ندامت سے سر جُھکا دیتے ہیں اور اپنے رب کے حضور گڑگڑاتے ہیں، معافی و درگزر کی درخواستیں کرتے ہیں اور آئندہ لغزشوں سے بچنے کی انتہائی کوشش میں لگے رہتے ہیں؟ یا پھر واقعہ یہ ہے کہ پوری بے پروائی بلکہ بے باکی سے اس کی حدود کو توڑا، اس کی شریعت کو ٹھکرایا اور اس کی آیات کو قدم قدم پر عملاً جھٹلایا جاتا ہے؟ کہیں رسم و رواج کی پابندی ہے، کہیں شریعتِ برطانوی کا اتباع ہے اور کہیں خود اپنے نفس کی اطاعت ہے۔ اور پھر یہ سب کچھ سہو و نادانی سے نہیں، پُورے اطمینان، مکمّل شعور اور کامل انہماک کے ساتھ دن رات کیا جارہا ہے۔ آخر اس کے بعد وَنَسْتَغْفِرُكَ کی یہ درخواست اپنے رَب سے مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟

یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ "توبہ و استغفار" کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسے کہ اپنی منزل کی طرف دیوانہ وار بڑھتے ہوئے کسی ایسے راہ گیر کا پاؤں، جو نہیں چاہتا کہ گندگی و غلاظت کی ایک چھینٹ بھی اس پر پڑے، اپنی طرف سے پوری احتیاط کے باوجود کسی گندی نالی میں گر

جاتا ہے۔ تو وہ اپنی آلودگی کا علم ہوتے ہی بے چین ہو کر پانی کی تلاش میں بھاگتا ہے اور جلد از جلد اس گندگی کو اپنے جسم سے دُور کر کے پھر اپنے راستے پر اور زیادہ احتیاط سے رَواں ہو جاتا ہے۔ یہی حال اللہ کے ایک مومن و مسلم بندے کا ہے کہ وہ دین کی راہ پر پُوری احتیاط سے چلتا ہے۔ مگر کہیں اتفاق سے اس کا پاؤں راہِ حق سے بھٹک کر گناہ کی غلاظت میں پڑ جاتا ہے تو وہ اس کا علم ہوتے ہی بے تاب ہو جاتا ہے، اللہ کے حضور روتا ہے، معافی مانگتا ہے، توبہ و استغفار اور صدقہ و خیرات تک کرتا ہے اور آئندہ زندگی میں پہلے سے زیادہ محتاط ہو جاتا ہے۔

لیکن جن لوگوں نے گناہ اور اللہ کی نافرمانی اور اس کے دین سے انحراف کو اپنا پیشہ اور معمول ہی بنا لیا ہو، ان کی ساری زندگی اور ان کی ساری قوتیں قیامِ کفر، خدمتِ طاغوت اور اطاعتِ نفس میں لگی ہوئی ہوں، ان کا خون تک خدا سے سرکشی کی راہ میں بہنے کے لیے بے تاب رہتا ہو، اپنی اولاد کو بھی اسی راہ پر چلنے اور بڑھنے کے لیے پرورش کر رہے ہوں اور اُن کی زندگی کا انتہائی مقصود اسی سمت میں بڑھنا ہو اور اسی میں فلاح و ترقی بھی سمجھتے ہوں اور محض عادتاً، ضمیر کی کھُجلی مٹانے کے لیے یا تقلید آباء کی بناء پر کچھ اسلامی طرز کی اصطلاحی عبادات اور بود و باش اختیار کیے ہوئے ہوں۔ ایسے حضرات کا وَ نَسْتَغْفِرُكَ یقیناً اپنے رب سے مذاق اور استہزاء ہے۔ اور اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ عفو و درگزر کا موجب

ہوگا یا اُلٹا فَلَنْ نَّزِیْدَکُمْ اِلَّا عَذَابًا[1] (۷۸ : ۳۰)

کیا وَنُؤْمِنُ بِكَ کے اقرار اور عہد کے بعد اب فی الواقع اللہ ہی پر ایمان رکھتے ہو اور سب زندہ و مردہ خداؤں سے کٹ کر صرف اسی ایک خدا سے اپنا رشتہ جوڑ لیا ہے کہ اب اسی کی حاکمیت تسلیم کرتے ہیں۔ اسی کے دین پر چلتے ہیں، اسی کے قانون و شریعت کو مانتے ہیں، اسی کے عذاب سے ڈرتے ہیں، ..... اسی کے انعام کا لالچ رکھتے ہیں، اسی کا کلمہ بلند کرنے کی فکر رہتی ہے، اسی کی رحمت کی آس ہے، اسی کے عہد کا پاس ہے، اسی کی سرپرستی کی طلب ہے۔ اور اسی سے ساری تمنّائیں وابستہ ہیں؟ یا پھر حقیقت یہ ہے کہ اللہ سے بیشتر معاملہ صرف زبانی جمع خرچ تک ہی محدود ہے اور عمل سارے کا سارا نہیں تو بیشتر اپنے نفس اور طاغوت کے لیے وقف ہے۔

کیا وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْكَ کے اقرار کے مطابق آپ نے فی الواقع دوسرے تمام بھروسوں اور وسیلوں کو چھوڑ کر صرف اللہ ہی پر توکّل کر لیا ہے کہ اب کوئی انعام و لالچ، کسی کی محبّت و عقیدت، کسی کی عظمت و جبروت، کوئی خوف و نقصان یا کوئی جاہ و جلال بھی آپ کو رام کرنے کی قوّت نہیں رکھتے بلکہ آپ کا تیز رو قافلہ حق پرستی کی راہ پر بلا خوف و خطر بڑھتا

---

[1] ہم ان کے عذاب کو سخت سے سخت تر کرتے چلے جائیں گے۔

چلا جاتا ہے اور آپ کے عزم و استقلال اور شیفتگیٔ منزل کا یہ حال ہو گیا ہے کہ شیشے کی مانند آپ کے لیے ٹوٹ جانا تو ممکن ہے مگر مڑنا اور خم کھانا اب آپ کے بس ہی سے باہر ہے۔ لیکن اگر اپنے نفس کی آرام طلبی، چند ٹکوں کے نقصان اور کچھ اعزّہ کی ناراضی کے احتمال جیسی چیزیں بھی دینِ حق کے ابتدائی مطالبات تک سے باز رکھنے کی قوّت رکھتی ہیں تو خدارا بتایئے کہ آپ نے آخر اللہ پر بھروسہ کیا کس چیز میں ہے؟ اور اس حال میں وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْكَ کی یہ رَٹ اللہ سے مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟

کیا وَنُثْنِي عَلَيْكَ الْخَيْرَ میں جس خلوص و خضوع، اللہ سے وابستگی اور اس کے دین کے لیے دیوانگی کا اظہار کیا جاتا ہے، اُس کی کوئی جھلک بھی آپ کی عملی زندگی اور روز کی دوڑ دھوپ میں دکھائی دیتی ہے؟ یا پھر اس عالم الغیب کو محض ایک دنیاوی حاکم تصوّر کر کے زبانی خوشامد اور چکنی چپڑی باتوں سے موہ لینے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں؟ اللہ سے چالبازی کرنے والوں کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بھی خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ہے اور دلوں کے بھیدوں تک سے واقف ہے۔ اس لیے جن جن کی حاکمیّت، عقیدت، محبّت، اطاعت، وابستگی اور کارسازی کا عقیدہ دل میں لے کر لوگ اس کے ساتھ خوشامدانہ رویّہ اختیار کر رہے ہیں، ایک دن وہ ان سب کو کھول کر سامنے رکھ دیگا اور پھر اُس وقت اُس کے سوا نہ کوئی ولی یا سرپرست دکھائی دے گا، نہ کسی طرف سے مدد کی توقع ہو گی، اور

جن فساق و فجار کی خدمت و سرپرستی اور توقیر و تقرب پر آج ناز ہے انہی کی قیادت میں اللہ کے عذاب کی طرف ہانکے جائیں گے۔

اور پھر وَنَشْكُرُكَ وَلَا نَكْفُرُكَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ کے آئینے میں بھی ذرا اپنی صورت ملاحظہ فرمائیے۔ کیا آپ نے فی الواقع ناشکری کی روش کو چھوڑ کر شکر اور اطاعت کی راہ اختیار کر لی ہے اور اللہ کے نافرمانوں اور سرکشوں سے اب کوئی واسطہ نہیں رکھتے؟ اور ہر ایک سے آپ کے تعلقات کی پختگی اور انقطاع سراسر اللہ ہی کی اطاعت اور نافرمانی پر منحصر ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ آپ کا عزیز ترین بھائی، باپ یا بیٹا ہو، شوہر یا بیوی ہو، حاکم و محکوم یا پیر و مرشد ہو؟ کیا اب آپ کی تمام قوتیں، قابلیتیں اور وسائلِ زندگی اللہ کے شکر کی راہ میں لگے ہوئے ہیں؟ دُور نہ جائیے، صرف ان قوتوں اور اشیاء ہی کو لیجیے جن کو اللہ تعالیٰ نے براہِ راست آپ ہی کے قبضۂ قدرت اور تصرف میں دے رکھا ہے۔ کیا اب آپ کی آنکھیں وہی کچھ دیکھتی ہیں، کان وہی کچھ سُنتے ہیں، زبان وہی کچھ بولتی ہے، دماغ وہی کچھ سوچتا ہے، دل اسی پر ریجھتا ہے، معدہ صرف وہی کچھ قبول کرتا ہے اور ہاتھ پاؤں اسی طرف حرکت کرتے ہیں جو اللہ کو مطلوب ہے؟ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ میں دے دیا ہے، اولاد کی شکل میں یا شاگردوں اور زیرِ تربیت اور زیرِ اثر اشخاص کی شکل میں یا ملازموں، محکوموں اور خادموں کی شکل میں، کیا آپ ان سب کو اسی راہ پر چلاتے ہیں جو اللہ

کو محبوب ہے؟ اور کیا آپ کی سب قوتیں اور سارے ذرائع و وسائل عین اس غرض کے لیے استعمال ہوتے ہیں جس غرض کے لیے اللہ تعالےٰ نے انہیں مرحمت فرمایا تھا؟ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے بلکہ "شکر" کے بجائے جان و مال اور دل و دماغ کی ساری نہیں تو بیشتر قوتیں اللہ سے سرکشی میں ہاتھ بٹانے اور اللہ کی زمین پر فتنہ و فساد پھیلانے میں لگی ہوئی ہیں۔ اور باپ بیٹے سے، بھائی بھائی سے، بیوی شوہر سے، محکوم حاکم سے اور مرید مرشد سے، اغراضِ نفس اور نفعِ دنیا کی خاطر خواہ کتنی ہی مرتبہ بیزاری و انقطاع کر چکے ہوں مگر اللہ کے دین اور اس کی اطاعت کے لیے ایک دوسرے سے علیٰحدگی کی نوبت تو درکنار، کبھی خفگی اور انقباض بھی محسوس نہیں کرتے، تو پھر بار بار کی اس غلط بیانی اور منافقت کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یا تو اپنے طرزِ عمل کو اپنے اس عہد و اقرار کے مطابق کیجیے یا پھر کھلے لفظوں میں نعوذ باللہ وَنَكْفُرُكَ وَ لَا نَشْكُرُكَ وَنُحِبُّ مَنْ يَّفْجُرُكَ کہیے کہ ہم تیری ناشکری اور نافرمانی کرتے ہیں، تیرا شکر نہیں ادا کرتے اور تیرے نافرمانوں کو محبوب رکھتے ہیں۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذَالِكَ۔

اللہ کا شکر محض "ش ک ر" سے مرکب لفظ کے تلفظ اور اس کی رٹ لگا دینے کا نام نہیں بلکہ اللہ کی کامل اطاعت و بندگی اور اس کی دی ہوئی ہر شے اور ہر قوت کو اسی کی مرضی کے مطابق اس کے دین کی سربلندی کے لیے خاص کر دینے کا نام ہے اور اسی کا اقرار وَنَشْكُرُكَ وَ لَا

نَكْفُرُكَ وَ نَخْلَعُ وَ نَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ کے ذریعے کرایا جاتا ہے۔
اور پھر کیا اَللّٰهُمَّ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ لَكَ نُصَلِّيْ وَ نَسْجُدُ کے اقرار کے مطابق اب فی الواقع آپ کی عبادت و غلامی اظہار عبودیّت و انکساری اور سجدۂ اطاعت صرف اللہ ہی کے لیے مخصوص ہو چکا ہے یا ایک فاحشہ اور عصمت فروش عورت کی طرح اپنے ایمان و اخلاق، دل و دماغ، ہاتھ اور پاؤں ہر چیز کی گویا دُکان لگا رکھی ہے کہ ان میں سے جو چیز جس غرض کے لیے کوئی چاہے خرید کر لے جائے۔ آپ کو تو بس چند ٹکوں کی ضرورت ہے اس سے کوئی بحث نہیں کہ ان کے عوض آپ کو کہاں اور کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر آپ کے دل و دماغ اور ہاتھ پاؤں کی قوتوں کا کرایہ یا ان کی قیمت دے دی جائے تو آپ سود و قمار اور شراب و افیون کا انتظام بھی کر دے سکتے ہیں۔ شریعتِ الٰہی کے صریح خلاف قوانین کے نفاذ و تشہیر کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں، نظامِ کفر کی پوری گاڑی گھسیٹنے کی خدمت انجام دے سکتے ہیں اور حد یہ ہے کہ غلبۂ کفر اور تسخیرِ حق کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا سکتے ہیں۔

اس پر عوام ہی نہیں بلکہ بہت سے علماء بھی مجبوری اور اضطرار کا عذر کرتے ہیں۔ لیکن وہ خدا کو گواہ کر کے بتائیں (کہ اصل معاملہ تو اسی سے ہے) کہ کیا ایسے لوگ حرام ذرائع سے صرف اضطرار کی حالت میں اور قوت لایموت کی حد تک ہی رزق حاصل کرتے ہیں یا آئندہ نسلوں تک کے لیے مالِ حرام اور خدمتِ کفر سے کمائے ہوئے روپے

کی تجوریاں بھر بھر کر رکھ رہے ہیں کہ بیٹے اور پوتے بھی اسی پر پلیں اور پروان چڑھیں اور ان کے جسم کی بھی ایک ایک بوٹی اسی مال سے بنے؟ کیا اس طریق پر حاصل کیا ہوا رزق کھاتے وقت اسی طرح کراہت اور بیزاری محسوس ہوتی ہے جس طرح ایک غلیظ اور ناپاک شے کو کھاتے وقت (بھوکوں مرتے ہی سہی) ہر صاحبِ ہوش انسان کو فطرۃً ہونی چاہیے۔ کیا جو شخص حلال رزق نہ پاکر اضطراراً مُردار کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے وہ اسی طرح مزے لے لے کر کھاتا ہے جس طرح آپ رزقِ حرام کو کھا رہے ہیں اور اسی طرح اُس مردار پر ڈیرا ڈال کر بیٹھ جاتا ہے جس طرح سے آپ اطمینان کے ساتھ ان حرام ذرائع رزق پر جم کر بیٹھے ہیں۔ اور کیا وہ اسی طرح مزید مردار کی تلاش میں رہتا ہے جس طرح آپ انہی حرام ذرائع میں اضافے کے متمنّی رہتے ہیں؟

اگر ایسا نہیں ہے تو آپ اپنے ایمان کی فکر کیجیے کہ اللہ کے ہاں فیصلہ مردم شماری کے رجسٹر کو دیکھ کر نہیں کیا جائے گا بلکہ اس پر کہ آپ نے اپنے اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَلَكَ نُصَلِّيْ وَنَسْجُدُ کے اقرار کا کوئی عملی ثبوت وَاِلَيْكَ نَسْعٰى وَنَحْفِدُ وَنَرْجُوْا رَحْمَتَكَ وَنَخْشٰى عَذَابَكَ کی صورت میں بھی دیا یا نہیں۔ یعنی یہ کہ عمر بھر اس کی راہ میں جدوجہد کی، اس کے دین کی خدمت و عَلَم برداری میں جان لڑاتے رہے، اس کی نظرِ رحمت کے سوا کسی کی پروا نہ کی، اور اس کے عذاب کے سوا کسی کے عذاب کا ڈر نہ رکھا بلکہ اِنَّ عَذَابَكَ بِالْكُفَّارِ مُلْحِقٌ

کے کامل یقین پر ساری زندگی گزار دی کہ فی الواقع اللہ کی نافرمانی اور اس کے عذاب کے درمیان اتنا وقفہ بھی حائل نہیں ہے کہ جتنا آگ میں ہاتھ ڈالنے اور اس کے جل جانے کے درمیان ہوتا ہے۔ آخر ایک حرکتِ قلب یا زیادہ سے زیادہ ایک سانس کے سوا دونوں کے درمیان اور کیا چیز حائل ہے؟ ادھر حرکتِ قلب اور سانس بند ہوئی اور خدا کا عذاب سامنے موجود ہے۔

خدارا سوچیئے کہ کیا آپ کی طرف سے واقعی اللہ کی راہ میں کوئی سعی کی جا رہی ہے؟ کیا اس کے لیے چوٹ کھائی ہے یا آگے ہی اس کی راہ میں کوئی چوٹ کھانے کا ارادہ ہے، کوئی نقصان اُٹھانے کی تڑپ ہے اور اپنا کچھ بھی اس کے دین کی خدمت میں لگایا ہے؟ یا پھر اُلٹا دین ہی کو صرف اس لیے ساتھ لگا رکھا ہے کہ وقت پڑے پر کام دے۔ جب ضرورت پڑی اسے نکال کھڑا کیا، کچھ جلسے کیے، کچھ جلوس نکالے، کچھ نعرے لگائے، کچھ لوگوں کو اُلّو بنایا اور مرعوب کیا اور اپنا سکّہ جمایا۔ بس اپنا کام نکالا اور اللہ کے دین کو پھر میان میں بند کر کے کسی تہ خانہ میں رکھ دیا۔ کیا اس وقت "مسلمانوں" کے ہاں دین کا مصرف اور مقصود طاغوت کی چاکری[1]، اس کی کونسلوں کی ممبری، اس کی عنایت کردہ

---

[1] یاد رہے کہ یہ مضمون ۱۹۴۴ء میں لکھا گیا تھا جس وقت یہاں انگریزوں کی حکومت تھی۔ اور قومی لیڈروں کو اسلام کی فکر سب سے زیادہ اس وقت لاحق ہوتی تھی جب کسی اسمبلی یا کونسل کی ممبری یا کسی عزیز کی نوکری کا سوال پیدا ہوتا تھا۔

رعایتوں سے نفع اندوزی، دنیوی مفاد کے کچھ تحفظات اور ایسے ہی دوسرے حقیر مادّی فائدے حاصل کرنے کے سِوا اور کچھ بھی ہے؟ اور کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اللہ کا دین صرف اسی حد تک قابلِ قبول ہے جہاں تک خواہشاتِ نفس، خوشنودیٔ طاغوت اور جاہِ دنیا کے حصول میں کام آسکے؟ گویا اب "فرزندانِ توحید" کا مطالبہ یہ ہے کہ ان کو خدا کے دین کے خادم نہیں بلکہ خدا کے دین کو ان کا خادم ہونا چاہیے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اگر آپ دُعائے مذکور کے بجائے وتر کی قنوت میں یہ دعا پڑھتے ہیں: اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ فِیْمَنْ ھَدَیْتَ وَعَافِنِیْ فِیْ مَنْ عَافَیْتَ وَتَوَلَّنِیْ فِیْمَنْ تَوَلَّیْتَ وَبَارِكْ لِیْ فِیْمَا اَعْطَیْتَ وَقِنِیْ شَرَّ مَاقَضَیْتَ فَاِنَّكَ تَقْضِیْ وَلَا یُقْضٰی عَلَیْكَ اِنَّہٗ لَا یَذِلُّ مَنْ وَّالَیْتَ تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَیْتَ، تو ذرا بتائیے کہ آپ نے اللہ کی ہدایت، عافیت، برکت اور سرپرستی حاصل کرنے کے لیے کونسا اور کیا عملی قدم اُٹھایا ہے؟ یا پھر اِنَّكَ تَقْضِیْ وَلَا یُقْضٰی عَلَیْكَ کے اس اقرار کے بعد بھی اللہ سے یہی کہہ رہے ہو کہ اپنی قوّت و اختیار سے تو ہم اس راہ پر چلنے کی کوئی کوشش نہیں کریں گے اور نہ اس کے لیے کوئی زخم کھانے یا نقصان برداشت کرنے کے لیے ہم تیار ہیں۔ ہاں اگر تُو چاہتا ہے تو اپنی قدرت سے یہ سب چیزیں زبردستی ہم پر لاد دے؟

آخری دُعا اور سلام

اب اپنی اس استدعا کی روشنی میں بھی اپنے اعمال اور مشاغلِ زندگی کا جائزہ لیجیے جو اللہ کی بارگاہ سے رخصت ہوتے وقت اس کے حضور پیش کی جاتی ہے، یعنی رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ ط "اے میرے رب! مجھے اور میری اولاد کو بھی اقامتِ صلوٰۃ کی توفیق عطا فرما! آقا! میری اس دعا کو قبول فرمالے اور حساب کے دن مجھے، میرے ماں باپ کو اور اپنے سب بندوں کو بخش دے"۔ اس دعاء کے الفاظ کو سامنے رکھیے اور ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ اقامتِ صلوٰۃ کے لیے کوئی بازی کھیلنا تو درکنار کیا اس کے لیے دل میں کوئی ولولہ اور جذبہ ہی ہے؟ یا پھر اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم تنہا یا کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ مِل کر قیام، رکوع اور سجدے کی حالت میں چند عبارتوں اور اُن کے الفاظ کا جاپ کر لینا ہی سمجھ رکھا ہے؟ اور اس خیال میں ہیں کہ جو ذمّہ داریاں اور جو کام یہ نماز آپ کے ذمّہ لگاتی ہے اور جن کے انجام دینے کا عہد یہ آپ سے بار بار لیتی ہے وہ سب محض اس کے الفاظ دُہرا دینے کی برکت سے کسی فوق الفطری طریق پر خود بخود انجام پا جائیں گے؟ یا پھر آپ کے نزدیک یہ نماز اور اس کے سب متعلقات سراسر بے معنیٰ اور مہمل ہیں اور ان سے کوئی ذمّہ داری آپ پر عائد نہیں ہوتی؟ بھائی جان!

اقامتِ صلوٰۃ کا اگر کچھ بھی عزم اور ارادہ ہے ـــــ اور ایسا نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ اس کے بغیر تو اسلام اپنے دائرے کے اندر ٹکنے کی بھی اجازت نہیں دیتا ـــــ تو اقامتِ صلوٰۃ کی حقیقت کو جانیئے اور اس کی ذمہ داریوں کو سمجھیئے اور ان کو ادا کرنے کے لیے کمر باندھیے۔

اس کے بعد ہم دائیں اور بائیں دونوں طرف تمام مخلوقِ خدا کے لیے اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ (تم سب پر اللہ کی رحمت اور سلامتی ہو) کی دُعا کرتے ہوئے نماز کو ختم کرتے ہیں۔

یہاں بھی ذرا اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھیے کہ کیا گرد و پیش کی مخلوق اور بندگانِ خدا کے لیے فی الواقع آپ کا دل سلام و رحمت کے جذبات سے لبریز ہے؟ اگر ایسا نہیں تو یہ سلام صریح منافقت کا سلام نہیں تو اور کیا ہے؟

اقامتِ صلوٰۃ کی حقیقت

اقامتِ صلوٰۃ کا منتہائے مقصود ایک ایسی سوسائٹی کو وجود میں لانا یا کم از کم اسے وجود میں لانے کی جد و جہد کرنا ہے جس کا جینا اور مرنا سب اِسی کام کے لیے ہو، جس کی پُوری زندگی اور ساری مصروفیتیں اسی غرض کے لیے وقف ہوں اور جس کا ایک ایک فرد اپنی انفرادی حیثیت میں اور پُوری سوسائٹی بحیثیتِ مجموعی بھی اس نصب العین کے لیے سرگرمِ عمل ہو کہ :-

(۱) خدا کے بندے پھر ہر طرف سے منہ موڑ کر اس کے ہو جائیں۔ خدائی اور مستقل بالذات حاکمیت و پیشوائی کے دوسرے تمام دعویداروں سے الگ ہو کر صرف اللہ وحدہٗ لاشریک سے تعلق جوڑیں اور اس کی ذات و صفات اور حقوق و اختیارات میں کسی جگہ بھی کسی دوسرے کی سرِ مو شراکت کو تسلیم نہ کریں۔ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ اور نُؤْمِنُ بِكَ کا یہی مطلب ہے۔

(۲) اللہ رب العالمین کو اور بس اسی کو اپنا واحد الٰہ، رب، مالک، آمر، حاکم، قانون ساز اور حاجت روا اور فریاد رس مانے اور اسی کے سامنے اپنے آپ کو جوابدہ سمجھے لَآ اِلٰهَ غَیْرُكَ اور اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے یہی معنیٰ ہیں۔

(۳) اس (اللہ) کو اور اسی ایک کو بے عیب، سب بڑائی، بزرگی اور کبریائی کا حقدار اور ہر حمد و ثناء اور تعریف و ستائش کا سزاوار گردانے۔ سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کا یہی مفہوم ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی ربوبیت، رزق رسانی اور امداد و استعانت کا خیال بھی دل میں نہ لائے اور اللہ کے بھروسے پر حق و انصاف کے قیام کے لیے باطل کے مقابلے میں بلا خوف ڈٹ جائے اور کسی حال میں اور کسی قیمت پر بھی باطل کے سامنے سرِ اطاعت خم کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ رب العالمین، نُؤْمِنُ بِكَ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْكَ وَاِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ

نَسْتَعِیْن اور نَسْتَعِیْنُکَ کے اقرار سے یہی مطلوب ہے۔

(۵) اللہ کے سوا کسی اور زندہ یا مردہ الٰہ کی اطاعت و بندگی یا غلامی و نیازمندی نہ کرے بلکہ (فرد اور سوسائٹی دونوں) کی تمام قوّت و قابلیّت اور سب ذرائع و وسائل اللہ ہی کی اطاعت و غلامی میں لگے ہوں۔ مطلوب یہ ہے کہ ایمان کا دعویدار ہر شخص گویا خدائی فوجدار بن کر رہے کہ جہاں کہیں خدا سے بغاوت و سرکشی، ظلم یا فساد یا جبر و تعدّی ہوتے دیکھے وہیں ظالم اور بدکار (فرد ہو یا گروہ) کا ہاتھ پکڑ کر اسے حق و انصاف کی طرف پھیر دے اَللّٰھُمَّ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَلَکَ نُصَلِّیْ وَ نَسْجُدُ وَاِلَیْکَ نَسْعٰی وَنَحْفِدُ اور اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّیِّبَاتُ کے اقرار کا یہی تقاضا ہے۔

(۶) اللہ کے سوا کسی اور کے روبرو جوابدہی کا اُسے ڈر نہ ہو اور اللہ کا ڈر اس کی پُوری زندگی (انفرادی، اجتماعی اور سیاسی) پر اس طرح محیط اور غالب ہو کہ کسی (فرد یا گروہ) کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ حق تلفی کرتے ہوئے بھی اسے اللہ کی رحمت و شفقت کے اسی طرح جوش میں آجانے کا خوف لگا رہے جس طرح ایک ماں کی محبّت اپنے بچّے کو کوئی تکلیف پہنچتی ہوئے دیکھ کر اسے آگ بگولا کر دیتی ہے۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ وَنَخْشٰی عَذَابَکَ اِنَّ عَذَابَکَ بِالْکُفَّارِ مُلْحِقٌ کے اقرار سے یہی کیفیّت پیدا کرنا مطلوب ہے۔

(۷) انفرادی، اجتماعی یا سیاسی کسی کام میں بھی اللہ کی نافرمانی کی راہ پر

چلنا یا اس کے باغیوں کے غلبے کے تحت اطمینان کی زندگی بسر کرنا تو درکنار ان سے کوئی دُور کا تعلق رکھنا بھی گوارا نہ کرے۔ بلکہ ان سے ان کے طور طریقوں سے علانیہ بیزاری کا اظہار کرے اور ان کی راہ سے بچنے اور اللہ کے محبوب اور مومن بندوں کی راہ پر چلنے کی جدوجہد اور اس کی کامیابی کے لیے دن رات دعائیں اور التجائیں کرے۔ وَنَشْكُرُكَ وَلَا نَكْفُرُكَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کے اقرار اور دُعا کے یہی معنیٰ ہیں۔

(۸) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اور صرف انہی کو اپنی پُوری زندگی، اس کے ہر کام اور ہر معاملے اور ہر قدم پر اپنا رہنما اور ہادی ماننے اور ان سے آزاد ہر رہنمائی کو گمراہی، ضلالت اور شرک فی الرسالت جانے۔ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ کی شہادت کا تقاضا یہی ہے۔

(۹) دینِ حق اور مذکورہ طرزِ زندگی سے اُسے اس درجہ مناسبت، دلی محبّت اور یگانگت ہو اور اس کے برکات و حسنات اس کے سامنے اتنے صاف اور واضح ہوں کہ اس طریقِ زندگی کی طرف رہنمائی کرنے والے رسولؐ کے لیے ہر لحظہ اور ہر آن اس کے دل سے بیساختہ دُعائیں نکلیں۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ اور اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى

مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ دراصل اسی کیفیت کی ترجمان ہیں۔

مختصر یہ کہ ہر فرد کی انفرادی اور پوری سوسائٹی کی اجتماعی زندگی اور ساری دوڑ دھوپ اس نماز ہی کی عملی تصویر ہو اور نماز اس کی تمام سرگرمیوں، مصروفیتوں، عزائم اور آرزوؤں کے لیے روشنی کا مینار ہو۔ اگر یہ صورت نہیں پیدا ہوئی اور نہ ہی اس کے پیدا کرنے کے لیے آپ کوئی سنجیدہ جدوجہد کر رہے ہیں تو بلاشبہ آپ اُن نمازیوں میں سے ہیں جو اپنی نماز سے غافل، اور اس کے تقاضوں سے بے پروا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو وَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ[1] کے زمرے میں شامل ہونے سے اپنی پناہ میں رکھے۔

آپ جانتے ہیں کہ پورے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی نماز پڑھ لینے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ ہر جگہ اقامتِ صلوٰۃ ہی کا حکم دیا گیا ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کی یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر اسے دین کا ستون قرار دیا گیا ہے جسے گرا دینے سے پورا دین گر جاتا ہے اور جس کا قیام دین کا قیام ہے، یہی وجہ ہے کہ نماز کو مومن اور کافر میں فرق کرنے والی چیز بتایا گیا ہے۔ ورنہ جہاں تک نماز کو محض "پڑھ لینے" کا تعلق ہے یہ تو سب منافقین بھی پڑھ لیتے تھے اور نہ صرف اسے مومنین کے ساتھ باجماعت پڑھتے تھے بلکہ دوسری اصطلاحی عبادات اور ظاہری دیندارانہ افعال میں بھی

---

[1] تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غافل اور بے پروا ہیں۔ (۱۰۷ : ۴-۵)

مومنین سے پیچھے نہیں رہتے تھے۔ لیکن جس چیز نے انہیں مسلمانوں کے زمرے سے خارج کر کے منافقین کے گروہ میں شامل کر دیا وہ یہی اقامتِ صلوٰۃ (جو دوسرے الفاظ میں اقامتِ دین ہی ہے) میں کوتاہی تھی جس میں وہ مخلصانہ اور دل کی گہرائیوں سے شریک نہیں ہوتے تھے۔

اب ان سب امور کو سامنے رکھ کر ٹھنڈے دل سے اپنے دعوئ ایمان و اسلام، اپنی نماز اور اس کے مقتضیات اپنی سرگرمیوں اور مصروفیتوں اور اپنے عزائم اور آرزوؤں کا باہم موازنہ کیجیے اور پھر اسلام میں اپنے مقام، میدانِ حشر میں خدا اور رسولؐ کے سامنے اپنی حالت اور آخرت میں اپنا ٹھکانا معلوم کرنے کی کوشش کیجیے۔

اذان کا مقصد اور اس کی حقیقت

نماز کے سلسلے میں ایک اور چیز جو ہر مسلمان کے لیے نہایت غور سے سوچنے اور سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہر بستی میں روزانہ پانچ مرتبہ ان کے رب کی طرف سے یہ اعلان ہوتا ہے:-

لوگو! بڑائی اور بزرگی صرف اللہ کے لیے ہے۔

لوگو! اللہ کے سوا کوئی بھی الٰہ اور رب نہیں جو تمہاری اطاعت و بندگی کا حقدار ہو۔

لوگو! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں (تمہارے رب نے انہیں تمہاری ہدایت و رہنمائی کے لیے بھیجا ہے، اپنی زندگی کی راہ انہیں

سے پوچھو اور انہی کے طریقے کی پیروی کرو)۔
لوگو! اللہ کی بندگی (نماز) کے لیے آؤ۔
لوگو! بھٹکتے نہ پھرو۔ فلاح اور نجات کی طرف آؤ۔
لوگو! پھر سُن لو کہ بڑائی اور بزرگی صرف اللہ کے لیے ہے اور اس کے سوا کوئی دُوسرا اطاعت و بندگی کے لائق نہیں۔
ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیے کہ یہ اعلان ان لوگوں کے سامنے کیا جاتا ہے جو خود اس ایمان کے دعوے دار ہیں کہ
(۱) اللہ ہی فی الواقع واحد الٰہ، رب، مالک، آمر و حاکم ہے، سب بڑائی اور بزرگی اسی کے لیے ہے، ہماری اطاعت و بندگی کا حقدار وہی ہے اور اسی کی اطاعت اور غلامی قبول کر کے ہم مسلمان بن سکتے ہیں اور مسلمان رہ سکتے ہیں۔
(۲) محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور ہمارے لیے واجب الاتباع ہیں اور اُن کی رہنمائی سے آزاد زندگی بسر کر کے یا ان کے کسی ایک حکم کو بھی عمداً جھٹلا کر دائرۂ اسلام میں کسی شخص کے لیے کوئی جگہ نہیں۔
(۳) نماز دین کا ستون اور مومن اور کافر میں فرق کرنے والی چیز ہے
اور یہ کہ
(۴) دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح صرف اسی راہ کو اختیار کرنے اور اسی پر چلنے پر موقوف ہے۔
اب لوگوں کا روزانہ پانچ مرتبہ مہینوں اور سالہا سال اس اعلان کو

اس طرح بے پروائی سے سُنتے رہنا گویا کہ ان کی زندگی سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ اسے سُن کر ذرا ٹس سے مس نہ ہونا، جو دس پانچ آدمی اسے سُن کر نماز کے لیے آ بھی گئے ان کا بے سمجھے بُوجھے نماز کو محض اٹیر کر چل دینا اور اقامتِ صلوٰۃ کی حقیقت اور اس کے تقاضوں کی طرف کبھی بھُولے سے بھی توجہ نہ کرنا، بلکہ باصرار کافرانہ روش پر چلتے رہنا، خدا کے غصّہ و غضب کو کس قدر بھڑکا دینے والی چیز ہے؟ کیا اللہ کی طرف سے حجّت تمام کرنے میں کوئی کسر باقی ہے اور کیا اس طرزِ عمل کے لیے خدا کے رُوبرُو پیش کرنے کے لیے کوئی جواب موجود ہے؟ اس بات کو سوچیے اور بار بار سوچیے۔

اللہ سے بار بار عہد اور اقرار کو استوار کر کے اسے پسِ پشت ڈال دینے والوں اور دن میں کئی کئی مرتبہ یاد دہانی کرائے جانے کے باوجود اپنے "حلفِ وفاداری" کو بھُول جانے والوں کو خوب اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ عنقریب ایک دن ان کے کانوں میں یہ صدا گونجنے والی ہے:

اَلْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا	آج ہم تمہیں اسی طرح بھول
نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا	جائیں گے جس طرح تم نے ہماری
وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ	آج کے دن کی ملاقات کو بھُلا
مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ ذٰلِكُمْ	رکھا تھا۔ اب تمہارا ٹھکانا آگ
بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ	ہے اور کوئی نہیں جو تمہیں اس
اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ	سے بچا سکے، یہ اس لیے کہ دنیا
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ	کی زندگی کے غرّے میں تم نے

لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ۝ (۴۵ : ۳۴-۳۵)

اللہ کے احکام اور اس کی وعیدوں کو مذاق بنا رکھا تھا۔ اب نہ تو تمہیں اس آگ سے نکالا جائیگا اور نہ تمہارا کوئی عذر قبول کیا جائے گا۔

دین پوری زندگی پر حاوی ہے۔

برادرانِ مکرّم! جیسا کہ اور بھی واضح کیا جا چکا ہے خدا کے دین کے حصّے بخرے نہیں کیے جا سکتے کہ اتنا تو مانیں گے اور اتنا نہیں مانیں گے، یا فلاں معاملات میں فلاں وقت تو مانیں گے اور فلاں معاملات میں یا فلاں وقت نہیں مانیں گے اور نہ ہی اس میں آدھے پونے پر کسی مصالحت کی کوئی گنجائش ہے۔ یہ تو دنیا میں زندگی بسر کرنے کا ایک متعیّن طریقہ ہے اور پوری زندگی کے لیے ایک مکمّل پروگرام پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ یا اس پروگرام پر چلا جائے گا یا اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ اللہ کے دین میں کسی درجے میں بھی کسی نوع کے شرک کی کوئی گنجائش نہیں۔ دوٹوک فرما دیا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ۝ (۴-۴۸) یعنی اللہ اس بات کو ہرگز معاف نہیں فرمائے گا کہ کسی نوعیّت سے بھی کسی دوسرے کو اس کے ساتھ شریک ٹھیرایا جائے۔ اس گناہ کے مرتکب کے سوا وہ جسے چاہے گا، معاف فرما دے گا۔ اور

واقعہ یہ ہے کہ جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیراتا ہے وہ بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ پس شرک وہ گناہ ہے کہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے مصالحت Compromise کی کوئی شکل ہی نہیں رکھی۔ مومنین سے اس کا مطالبہ ہی یہ ہے کہ اپنے سب کچھ سمیت اور غیر مشروط طور پر اپنے آپ کو اللہ کی بندگی اور رسول کی اطاعت میں دے دو۔ اس سے کمتر وہ کسی شے پر راضی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک پوجا پاٹ کی شکل میں خدا کی عبادت کا تعلق ہے یہ تو دنیا میں ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں ہوتی رہی ہے۔ اور اب بھی دنیا میں تقریباً ہر جگہ کسی نہ کسی شکل میں ہو رہی ہے۔ مگر اپنی پوری زندگی کو اللہ کی بندگی میں دے دینا، اس کی ذات ہی نہیں، اس کی صفات، حقوق اور اختیارات میں کہیں بھی کسی دوسرے کو شریک کرنے سے اجتناب کرنا، اسی سے انسان جی چرا تا رہا ہے اور ــــ ریل گاڑی کے اس احمق اور ناعاقبت اندیش ڈرائیور کی طرح جو ریل کی پٹڑی کو صحیح راہ کے بجائے اپنی آزادی پر خواہ مخواہ کی قید اور راہ کی رکاوٹ سمجھنے لگے اور کسی کھلے میدان، خوشنما پارک یا کسی پہاڑ کے پُر فریب مناظر سے للچا کر ریل گاڑی کو پٹڑی سے اُتار کر اس کا رُخ اس طرف کر دے ــــ اکثر خواہشاتِ نفس، اور فریبِ شیطان میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ شاہ راہِ ہدایت، نشاناتِ عافیت اور حدودِ حرام وحلال کو اپنے اختیارات اور آزادی پر قید و بند اور خواہ مخواہ کی روک سمجھ کر اپنی زندگی کی ریل گاڑی کو ــــ کہیں کسی کے جاہ وجلال سے مرعوب ہو کر، کہیں کسی

کی قوّت و جبروت سے دَب کر، کہیں ترقّی و سربلندی کے لالچ میں، کہیں کسی کے حُسن جمال میں گرفتار ہو کر، کہیں خود اپنے نفس کی غلامی میں مُبتلا ہو کر اور کہیں محض دُوسروں کے ساتھ بھیڑ چال میں شریک ہو کر ـــــ اس شاہ راہِ حیات سے اُتار کر بار بار تباہی و بربادی سے دوچار کرتا رہا ہے۔ اور خدا کے رسول بار بار آ کر انسانوں کو اپنی اطاعت خدا کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کی راہ اختیار کرنے کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ اِعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ ..... (۹۸ : ۵) یعنی پُوری یکسوئی کے ساتھ اپنی اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے اس کی بندگی اختیار کرو ..... مگر انبیاء علیہم السّلام کے اس مطالبے اور اپنی نمازوں میں روزانہ کئی کئی مرتبہ تجدید کیے جانے والے عہدوں کو سامنے رکھ کر اپنی پُوری زندگی اور اس کے مشاغل اور اپنی مصروفیتوں کا سنجیدگی سے جائزہ لیجیے اور سوچیے کہ ہم کیا کرتے رہے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیے تھا؟ اپنی زبان سے ہم اللہ تعالیٰ سے کیا عہد و پیمان کرتے ہیں اور ہمارے عمل سے کیا ظاہر ہو رہا ہے؟ کیا ہم محض ایک گراموفون یا کسی نشر گاہ کا مائیکروفون ہی تو بن کر نہیں رہ گئے، کہ کہنے کو تو سب کچھ کہتے رہتے ہیں، مگر اسخر کورے کے کورے اور ایک بے جان آلہ ہی کی طرح غیر متاثر رہے۔ یہاں تک بھی معاملہ رہتا تو غنیمت تھا کہ زیادہ سے زیادہ بے عملی ہی کے مرتکب ہوتے۔ مگر یہاں تو ہر عمل اپنے عہد سے متعارض ہے۔ اور پھر اپنے اس طرزِ عمل پر اصرار ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ، حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ[1] اور وَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ[2] کے مصداق ہونے سے اپنی پناہ میں رکھے۔

مگر اس دنیا میں کوئی چیز بھی محض چاہنے سے نہیں ہو جاتی۔ ورنہ کون انسان ہے جس کے اندر امن و سلامتی اور بھلائی کی خواہشات موجود نہ ہوں۔ اگر صرف چاہنے سے کچھ ہو جایا کرتا تو دنیا میں کبھی کوئی فتنہ و فساد رونما نہ ہوتا۔ اس لیے اگر فی الواقع اس انجام سے بچنا اور اللہ کے ہاں مقبولیت مطلوب ہے تو بس ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کا نام لے کر کمر باندھیئے اور اپنی پوری زندگی میں اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی رہنمائی عملاً اختیار کیجیے، جو اُن سے جڑے اس سے آپ بھی جڑ جایئے، جو اُن سے کٹے اس سے آپ بھی کٹ جایئے، اپنی نماز اور دوسری عبادات کو بامقصد بنایئے، ان میں کیے جانے والے عہدوں کی ذمّہ داریوں اور مقتضیات کو پورا کرنے کی فکر کیجیے، ان تمام مشاغلِ زندگی اور مصروفیتوں کو ترک کر دیجیے جو آپ کے نصب العین اور اللہ

---

[1] تم لوگ دنیا طلبی کی دَوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں منہمک رہو گے یہاں تک کہ قبروں میں جا پڑو۔ (۱۰۲ : ۱-۲)

[2] تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غافل اور بے پروا ہیں۔ (۱۰۷ : ۴-۵)

کے بتائے ہوئے مقصدِ حیات کے خلاف یا اس طرف نہ لے جانیوالی ہوں - اور ان راہوں کو عملاً اختیار کیجیے جن پر چل کر (انبیاء اور صلحاء) اس منزل پر پہنچے ہیں - نیز اس نصب العین کی طرف بڑھنے والے ساتھیوں کی تلاش کیجیے تاکہ ان کی اجتماعی قوت سے ان رُکاوٹوں کو دُور کیا جائے جو دینِ حق اور بالخصوص اس کے اجتماعی نظام کی راہ میں حائل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ اور رسُول اور کتابِ الٰہی نے غسل اور طہارت، نکاح وطلاق اور نماز روزے کے احکام ہی نہیں دیئے ہیں بلکہ ہماری انفرادی، معاشرتی اور تمدّنی زندگی سے آگے معاشی، اجتماعی اور سیاسی زندگی اور ان کے ایک ایک شعبے کے لیے ایک مکمّل اور متعیّن پروگرام دیا ہے۔ انہوں نے اپنا نظامِ حکومت اپنا نظامِ عدالت اور اپنے قوانینِ ملکی دیئے ہیں اور ان سے بھی آگے انہوں نے اپنا بین الاقوامی قانون اور صلح وجنگ کے اپنے ضابطے دیئے ہیں۔ پھر ان سب کو بحیثیّتِ مجموعی قبول یا رَد کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور انکار پر حبطِ اعمال، سراسر ہلاکت اور ابدی خسران کی خبر دی ہے، لہٰذا اگر ہمیں مسلمان بننا اور مسلمان رہنا ہے تو اس کے سوا چارۂ کار نہیں کہ ان کے اس مطالبے (جس کا دُوسرا نام دینِ حق ہے) کو من وعن تسلیم کریں۔ اور اگر ایسا کرنے میں کوئی رکاوٹ حائل ہو یا حالات ناموافق ہوں تو اپنی پُوری قوّت سے اس رکاوٹ کو دُور کرنے اور ان حالات کو بدلنے کی جدوجہد کریں اور اس وقت تک چین نہ لیں جب تک کہ اللہ اور رسول کا ایک ایک حُکم اور اُن

کے احکام کا ایک ایک جزئیہ زمین کے چپّے چپّے پر بالفعل قائم اور کارفرما نہ ہو جائے اور خدا کی مرضی اس کی زمین پر بھی اسی طرح نہ پوری ہونے لگے جس طرح آسمانوں پر پوری ہو رہی ہے۔ یہی اقامتِ دین ہے۔ اسی کو نظامِ اسلامی کہتے ہیں اور اسی کا نام حکومتِ الٰہیہ ہے۔ (جس کے لیے پاکستان قائم کیا گیا تھا۔)

حیرت ہے کہ ریت کے ذرّے بھی اتنی تعداد میں کسی خطۂ ارض میں جمع ہو جائیں تو اسے ریگستان بنا دیتے ہیں اور پانی کے قطرے بھی اس تعداد میں کہیں جمع ہو جائیں تو وہ سیلاب بن کر بہہ نکلتے ہیں لیکن دنیا میں اتنے مسلمان موجود ہوتے ہوئے بھی اسلامی نظام کہیں قائم نہیں۔ خدا کے لیے خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر اپنے اعمال پر تنقیدی نگاہ ڈالیے۔ یہود کے نقشِ قدم پر چلتے رہو گے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہود کا سا برتاؤ آپ کے ساتھ نہ کیا جائے۔

آج دُنیا میں نظامِ اسلام کیوں قائم نہیں ہے؟

جن حضرات کو اپنے فرائض کا احساس ہو چکا ہے انہیں خوب غور کرنا چاہیے کہ دنیا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کروڑوں کی تعداد میں مسلمان پھیلے ہوئے ہونے کے باوجود آخر اسلامی نظام کہیں بھی کیوں موجود نہیں؟ یہ واقعہ ہے کہ کسی قوم یا ملک کا نظامِ سیاست اور نظامِ حکومت بالعموم اس کی اپنی معاشرت، طرزِ زندگی اور افکار و خیالات

کا طبعی نتیجہ ہوا کرتا ہے، اس لیے اگر مسلمانوں میں اسلامی نظامِ حیات مفقود ہے تو ماننا پڑے گا کہ زبانی اقرار بلکہ اصرار کے باوجود انہوں نے مجموعی حیثیت سے اسلامی معاشرت، طرزِ زندگی اور افکار و خیالات کو ترک کر دیا ہے۔ اور جو کچھ اس کے بجائے اختیار کیا ہے وہ ان کے نظامِ سیاست اور نظامِ حکومت سے ظاہر ہے اور اسے جو نام چاہے دے لیجیے، مگر بہرحال یہ قرآنی نظام تو نہیں ہے اور اگر یہ نہیں تو خود ہی بتائیے فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰل (۱۰ : ۳۲) نظامِ حق کو چھوڑ دینے کے بعد گمراہی اور ضلالت کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود قوم کی قوم یہود کی سی خوش فہمیوں اور فریبِ نفس میں مبتلا ہے۔ اور گمراہی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جس کی آخری حد تک یہ نہ پہنچی ہو، لیکن اس کے باوجود "مسلم" کا وہ خطابِ عظمت جس کو جدِ انبیاء سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ہزاروں آزمائشوں اور امتحانوں سے گزر کر — دینِ آباء سے بغاوت کر کے، پوری قوم سے کٹ کر، آتشِ نمرود سے گزر کر، بے یارو بے دیار دیس دیس کی خاک چھان کر اور پھر اس غریب الوطنی اور مسافرت کی زندگی میں عین بڑھاپے کے وقت دنیا کے آخری سہارے، جوان لختِ جگر سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری چلا کر اور ہوش سنبھالنے سے آخری دم تک اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا عملی نمونہ پیش کر کے — حاصل کیا تھا، ان کے خیال میں ان سے کچھ اس طرح چپک گیا ہے کہ یہ جو جی

میں آئے کرتے رہیں لیکن یہ مقدّس نام کسی حالت میں اُن سے جُدا نہیں ہوسکتا، اور اس خلعتِ خداوندی کے حصول کے لیے بھی اب ان کے نزدیک صرف کسی مسلمان نامی گھرانے میں پیدا ہوجانا کافی ہے۔ اس کے بعد ان کے لیے فساق و فجار کی ساری راہیں کھلی ہیں۔ جیسی چاہیں فاسقانہ زندگی بسر کریں، انکارِ خدا تک نوبت آجائے، پوری کی پوری زندگی غیر اللہ کی اطاعت میں دے دیں، اللہ کی دی ہوئی ہر شے راہِ کفر میں نثار کردیں۔ لیکن نہ جنّت کے حاصل ہونے میں کوئی شک، نہ شفاعتِ رسُول کے استحقاق میں کوئی شبہ اور نہ ان کے اسلام میں کوئی رخنہ پیدا ہوتا ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ یہ کہ چند دن سزا بھگت کر پھر جنّت میں چلے آئیں گے گویا کہ مسلمانوں کی نسل میں پیدا ہوجانے سے یہ خدا کے چہیتے بن گئے ہیں۔

ذرا سنجیدگی سے سوچیے کہ آخر یہود کا کیا قصور تھا؟ وہ غریب بھی تو یہی کہتے تھے کہ جنّت ان کے لیے بہرحال مخصوص ہے اور اگر سرکشی اور طغیان کی وجہ سے آگ میں ڈالے بھی گئے تو بس چند دن کے لیے لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً[1] (۲ : ۸۰) لیکن اسی کی بنا پر نہایت غضبناک ہوکر اُن سے پُوچھا گیا اِتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا ..... اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۲ : ۸۰) کہ کیا تم نے اللہ سے (جنّت کی) کوئی

---

[1] بفرضِ محال اگر ہم آگ میں ڈالے بھی گئے تو بس گنتی کے چند روز کے لیے۔ (۲ : ۸۰)

گارنٹی لے لی ہے ..... یا اللہ کے بارے میں یونہی من گھڑت باتیں کہہ رہے ہو؟" یہ لوگ شریعتِ خداوندی کے مطابق عبادت بھی کرتے تھے، بہت سے معاملات میں شریعتِ الٰہی کا اتباع بھی کرتے تھے اور دینِ حق کے کچھ حصّے ہی چھوڑ کر کفر سے مصالحت کر بیٹھے تھے اور اغراضِ نفسانی کے حصول کے لیے تاویلیں وغیرہ کر لیتے تھے۔ مگر ان کو سخت تنبیہہ کی گئی۔ فرمایا: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۰ (۲ : ۸۵) کیا کتابِ الٰہی کی کچھ باتیں مانتے ہو اور کچھ نہیں مانتے؟ یاد رکھو کہ اللہ کے دین کا تجزیہ کرنے والوں کے لیے دنیا میں ذلّت اور آخرت میں بدترین عذاب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ برادرانِ عزیز! اللہ سے معاملہ کسی نسل، قوم، ملک یا خاندان کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اس کی اطاعت اور اس کے رسولؐ کے اتباع کی بنا پر ہے۔ قرآنِ کریم نے صاف الفاظ میں اعلان کر دیا ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ	جس نے ذرّہ برابر بھلائی کی
ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ط وَمَنْ	ہوگی وہ اسے دیکھ لیگا اور جس
يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا	نے ذرّہ برابر برائی کی ہوگی وہ
يَّرَهٗ (الزلزال: ۷-۸)	اسے دیکھ لے گا۔

اور پھر پوری نوعِ انسانی کو کھلے لفظوں میں نوٹس دیدیا ہے:

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۰ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ

اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝ ذٰلِكَ
الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ۝
اِنَّا اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۝ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ
مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ ۔ (النباء : ۳۸-۴۰)

یعنی اس روز جبرئیل اور فرشتے صفیں باندھے دم بخود کھڑے ہوں گے کسی کی مجال نہ ہوگی کہ رحمٰن کے اذن کے بغیر لب بھی ہلا سکے اور اگر اس کی اجازت ملے گی بھی تو وہ صرف مناسب اور واجبی بات ہی عرض کرے گا (اب خوب کان کھول کر سُن لو) یہ دن آ کے رہے گا۔ اب جس کا جی چاہے اپنے رب کے ہاں اچھا ٹھکانہ بنانے کی فکر کر لے (ہم نے حجت پوری کر دی اور) تمہیں اس عذاب سے آگاہ کر دیا جو بالکل تمہارے سر پر لٹک رہا ہے۔ پھر اس دن ہر شخص اپنے کرتوتوں اور اُس کمائی کو دیکھ لے گا جو وہ دنیا میں کرتا رہا۔

شفاعتِ رسول اور مسلمان کہلانے کے باوجود کافرانہ نظامِ حیات اور فاسقانہ قیادتیں قبول کرنے والوں کی کیفیت یوں بیان فرمادی :

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي
اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ۝ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ
لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ۝ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ
بَعْدَ اِذْ جَاءَنِيْ ۝ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ

قَوْمِي اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ٥ (الفرقان-
۲۷ - ۳۰)

جس دن ہر ظالم اور گنہ گار حسرت کے ساتھ کہے گا، اے کاش! مَیں نے رسُول (جس کی رسالت کا زبانی اقرار بھی کرتا تھا) کی بتائی ہوئی راہ، اس کی رہنمائی اور قیادت کو عملاً بھی اختیار کر لیا ہوتا - اسے کاش! مَیں نے فلاں فاسق و فاجر کی دوستی اور قیادت اختیار نہ کی ہوتی، اس کمبخت نے تو میرے دینِ حق پا لینے کے بعد پھر مجھے گمراہی میں ڈال دیا۔ اور اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سامنے (ایسے لوگوں کی شفاعت کرنے کے بجائے قرآن مجید کو ہاتھ میں لے کر اللہ سے) فریاد کریں گے کہ اَے میرے رَب! یہ ہیں میری قوم کے وہ لوگ جنہوں نے تیرے اس قرآن کو پسِ پُشت ڈال رکھا تھا اور مجھے اور تیرے دین کو دُنیا میں رُسوا کرتے رہے۔

غور کیجیے کہ اگر مسلمان بھی اللہ کے دین کو چھوڑ کر دُوسرے طریقہ ہائے زندگی کی پیروی شروع کر دیں - احکامِ الٰہی کو دنیا کی متاعِ قلیل اور ذلیل دنیوی فوائد کی خاطر قربان کرنے لگ جائیں، نظامِ حق کو نظامِ باطل کی ہر آلائش سے کلیتہً پاک رکھنے کی پُوری کوشش کرنے کے بجائے الٹا ان کا باہم جوڑ ملانے ہی کو اپنے علم و فضل اور قرآن دانی کا کمال سمجھنے لگ جائیں - خدا کی خدائی، اور

حاکمیّت کے سامنے نہ خود جھکیں نہ جھکنے والوں کا ساتھ دیں، دنیا جہان کو اسلام اور اس کی برکات کے وعظ کہتے پھریں اور خود اپنی ذات کو اس کی پابندیوں سے بالاتر رکھیں اور اقامتِ صلوٰۃ کے مقتضیات پورا کرنا تو درکنار اسے محض رسماً پڑھ لینا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھیں۔ اس کے بعد آخر کس بنا پر وہ یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان کا انجام یہود کے انجام سے مختلف ہوگا؟ خدا کے لیے خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر اپنے اعمال پر تنقیدی نگاہ ڈالیے۔ یہود کے نقشِ قدم پر چلتے رہو گے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہود کا سا برتاؤ آپ کے ساتھ نہ کیا جائے۔ خدا کا قانون بالکل بے لوث ہے: نبی کا بیٹا بھی سرکشی کرے گا تو ڈبو دیا جائے گا۔ وہاں تو صرف اعمال کی پوچھ ہوگی نہ کہ نسل اور نسب کی۔ اپنی حیثیّت پہچانیے، اپنے فرائض کو جانیے اور دینِ حق کی جو امانت خدا کے رسولؐ نے آپ کے سپرد کی تھی اس کی ذمّہ داریوں کا احساس کیجیے، نبوّت کے فرائض اب قیامت تک آپ (امّت) ہی کے ذمّہ ہیں۔ اللہ کی کتاب اور حضورؐ کی سُنّت آپ کے پاس ہے اور ان کے ذریعے دوسرے بندگانِ خدا پر دین کی حجّت تمام کرنا آپ کا فرض ہے۔ چنانچہ فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۱۰)

اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ نیکی اور بھلائی

کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو۔

اور :-

وَجَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً	ہم نے تمہیں امتِ وسط بنایا
وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ	ہے تاکہ تم (ہمارے روبرو)
عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ	دوسرے لوگوں پر اس امر کی
عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔	شہادت دے سکو کہ دینِ حق
(البقرہ : ۱۴۲)	کی جو امانت ہمارے رسولؐ

نے تمہارے سپرد کی تھی وہ تم نے ان تک پہنچا دی اور ہمارا رسول تم پر شہادت دے گا کہ ہم نے اپنے دین کی جو امانت اس کے سپرد کی تھی وہ اس نے تمہیں پہنچا دی۔

خدا کی اس امانت کو اُمّت کے سپرد کرنے کے بعد اس کے متعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا :

وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ	اس خدا کی قسم جس کے قبضۂ
لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَ	قدرت میں میری جان ہے
لَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ	تمہارے لیے لازم ہے کہ معروف
لَتَأْخُذُنَّ عَلٰى يَدِ الْمُسِيْٓءِ	کا حکم دو اور برائی سے لوگوں
وَلَتَأْطُرُنَّهٗ عَلَى الْحَقِّ	کو منع کرو اور بدکار کا ہاتھ پکڑو
أَطْرًا اَوْ لَيَضْرِبَنَّ اللّٰهُ	اور اسے حق کی طرف موڑ دو،
قُلُوْبَ بَعْضِكُمْ عَلٰى بَعْضٍ	ورنہ اللہ تعالیٰ بدکاروں کے

اَوْ لَيَلْعَنَكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ	دلوں کا زنگِ معصیت حق پرستی
ابنِ کثیر جلد ۲ ص ۸۳	کے دعویداروں کے دلوں پر
تفسیر المائدہ ۷۸-۷۹	بھی چڑھا دیگا یا تم پر بھی اسی

طرح لعنت کردے گا جس طرح یہود پر کی۔

دعوتِ اسلامی کا طریق

عزیزانِ گرامی!

اپنی، اپنے اعزّہ، اپنی قوم اور پُوری نوعِ انسانی کی تصویر قرآن کے آئینے میں دیکھیے اور جس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم اور اپنے رسولؐ کو دنیا میں بھیجا تھا اور جس مقصد کے لیے رسولؐ کے بعد آپ کو امّتِ وسط اور خیر امّت بنایا گیا تھا، اس غرض اور اس مقصد کو لے کر اُٹھیے۔ کیونکہ اللہ کے جس دین کو آپ نے قبول کیا ہے وہ آپ سے صرف ذاتی اصلاح و تقویٰ اور انفرادی دینداری ہی نہیں مانگتا۔ بلکہ اس نے اس بات کو بھی بالکل کھول کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے کہ بقیہ نوعِ انسانی کی رُشد و ہدایت کا کام آپ کے ذمّہ ہے اور اگر آپ نے یہ نہ کیا یا اس میں کسی قسم کی کوتاہی برتی تو گویا آپ نے اپنا فرض منصبی ہی ادا نہیں کیا۔ اس کام کی جواب دہی بھی آپ کو خدا کے رُوبرو اُسی طرح کرنی ہوگی جس طرح کہ نماز روزے اور دُوسرے فرائض میں کوتاہی کے لیے کرنی ہے۔

اس کے علاوہ اس دنیا کی زندگی کی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جو قوم اپنے نصب العین اور مقصدِ زندگی کو بھلا دیتی ہے، اس کے مقتضیات اور ضروریات کے مطابق اپنا طرزِ عمل نہیں رکھتی اور ان کے حصول کے لیے چوٹ کھانے اور مسلسل ایثار و قربانی اور جدوجہد کرنے کے لیے کمربستہ نہیں رہتی تو اس کا صفحۂ ہستی سے مِٹ جانا اُسی طرح سے یقینی ہے جس طرح سے کہ تیل ختم ہو جانے کے بعد چراغ کا گُل ہو جانا۔

پہلا قدم

اِن حالات میں جب کہ اسلام کا باغ ویران ہو چکا، اس کے باغبان اُسے چھوڑ کر دُوسرے کاموں میں لگ چکے اور دنیا کی متاعِ قلیل نے انہیں اس طرح اُلجھا لیا کہ خود ان میں سے ایک کثیر انبوہ بھی اس کی بُنیادوں کو کھوکھلا کرنے اور ڈھانے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہا ہے، تو سب سے پہلا قدم اللہ کے دین اور اس کے مقتضیات کو سمجھ کر اور اس کی ساری ذمّہ داریوں کو سامنے رکھ کر اسے ایک مکمّل نظامِ زندگی کی حیثیت سے شعور کے ساتھ قبول کرنا ہے اور اس عزم کے ساتھ قبول کرنا ہے کہ اب آئندہ جب تک دَم میں دَم ہے، رگوں میں خون ہے اور دماغ میں عقل ہے، جانتے بُوجھتے کوئی حرکت بھی ایسی نہیں کرنی ہے جو اس کے خلاف ہو۔ فرمایا: قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ (۶ : ۱۴) یعنی ان سے کہو کہ اس نے مجھے

حکم دیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دوں۔ پھر گرد و پیش میں جو کروڑوں کی تعداد میں دین سے غافل مسلمان نامعلوم میں کافرانہ زندگی بسر کر رہے ہیں انہیں بھی وہی کچھ کرنے کی دعوت دینا ہے جو آپ نے کیا ہے۔ اور انہیں سمجھانا ہے کہ مسلمان بننے اور مسلمان رہنے کے لیے ایک متعیّن طرزِ زندگی اور نظامِ حیات کو قبول کرنا ضروری ہے، صرف زبانی اقرار جس کی اعمال و افعال سے تائید نہ ہو کافی نہیں اور نہ اس سے کتاب و سنّت کا منشاء پورا ہوتا ہے، پھر ان کو بتانا ہے کہ مسلم سوسائٹی کے جمود اور اس کے تعطّل کو توڑنے اور اُن میں اقامتِ دین کا احساس پیدا کرنے اور اسلامی عقیدے اور نصب العین کی طرف بُلانے کی ذمّہ داری ہر صاحبِ ایمان پر ہے۔

جب اسے وہ اچھی طرح سمجھ لیں تو پھر ایک طرف تو ان پر یہ واضح کیا جائے کہ ایک نظامِ باطل کے اندر رہتے ہوئے مسلمانوں کی سی زندگی بسر کرنا کیوں اور کیسے دشوار ہے۔ اور اس نظام میں اسلام کا کتنا حصّہ عملاً معطّل ہو گیا ہے اور باطل نظامہائے زندگی کی بدولت دنیا میں کتنا فساد برپا ہے اور دُوسری طرف توحید و رسالت پر ایمان لانے کے مقتضیات بتدریج ان کے سامنے لائے جائیں، اور یہ کہ ان کے حصول اور تکمیل کے لیے اسلامی نظامِ حیات کو عملاً نافذ کرنا ایک ناگزیر ضرورت ہے اور یہ کام منظم جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

جب یہ احساس بھی پیدا ہو جائے تو انہیں خود اس کی فکر ہو گی کہ ہمیں بحیثیت جماعت کے منظم ہونا چاہیے۔ اس وقت ان کے سامنے تحریکِ اسلامی کے نصب العین اور طریقِ کار اور اس کے کام کو پیش کر دیا جائے اور انہیں یہ بتا دیا جائے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ لازماً تحریکِ اسلامی ہی میں شریک ہو کر قیامِ دین کی جدوجہد کریں۔ اگر ہمارے طریقِ کار سے اتفاق ہو اور ہم پر اعتماد ہو تو ہمارے ساتھ شریک ہو جائیے، اگر یہ نہیں اور کسی دوسری جگہ بھی آپ کے علم میں یہ جدوجہد کی جا رہی ہے اور وہاں آپ کو اطمینان ہے تو وہاں شریک ہو جائیے، اور اگر یہ بھی نہیں تو پھر اپنے جیسے دُوسرے ہم خیال لوگوں کے ساتھ مل کر اس کام کے لیے اپنے آپ کو منظم کیجیے۔ بہرحال اقامتِ دین کے لیے جماعتی طریق پر منظم جدوجہد کیے بغیر چارہ نہیں اور نہ اس کے بغیر دین کا منشاء پُورا ہوتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ اس وقت جبکہ پُوری دنیا پر دینِ طاغوت قاہرانہ قوت کے ساتھ چھایا ہُوا ہے، اس کو اُکھاڑ کر اس کی جگہ دینِ حق (نظامِ اطاعتِ الٰہی) کو قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ تو سانپوں سے کھیلنے اور ہاتھیوں سے ٹکرانے کے مترادف ہے۔ اس میں جان و مال بلکہ ہر چیز کا زیان ہے اور اس کا صرف احتمال ہی نہیں بلکہ یقینی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو ان نقصانات ہی کو اس راہ کے نشانات بتایا ہے۔ فرمایا :

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ۔

(البقرہ : ۱۵۵)

ہم ضرور ہی تمہیں خوف و خطر، فقر و فاقہ، جان و مال کے اور پھلوں کے نقصانات میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے، جو لوگ اس کے باوجود ثابت قدم رہیں، اُن کے لیے (ان کے رب کی طرف سے عنایات اور رحمت کی) بشارت ہے۔

اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی :

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

(آل عمران : ۱۴۲)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنّت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جو فی الواقع اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔

نیز یہ کہ :-

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا

کیا لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ محض (زبان سے)

وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ
فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ
فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ
صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ
الْكٰذِبِيْنَ ۝
(العنکبوت : ۲-۳)

کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے
آئے چھوڑ دیئے جائیں گے اور
انہیں آزمایا نہیں جائیگا؟ حالانکہ
ان سے پہلے (سب) لوگوں کی
آزمائش کی گئی؟ یقیناً اللہ یہ
معلوم کر کے رہیگا کہ کون اُس
سے اپنے عہد میں صادق ہیں اور کون محض زبانی جمع خرچ کرنے
والے ہیں۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ
تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ
الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ
وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا
الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً۔
(التوبہ : ۱۶)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے
کہ بس یُونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے
حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا
ہی نہیں کہ تم میں سے کون لوگ
واقعی اللہ کی راہ میں لڑ جانے
والے ہیں اور انہوں نے فی
الواقع اللہ اور اس کے رسول
اور مؤمنین کے علاوہ کسی اور کو اپنا جگری دوست نہیں بنا رکھا ہے۔

اس لیے اگر دینِ حق اور اطاعتِ الٰہی کو رسماً نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے کہ فی الواقع اللہ کے سوا کسی اور کا الٰہ نہ ہونا ایک حقیقت ہے اور محمدؐ کے دامن کے سوا کہیں عافیت کی جگہ نہیں ہے، اور ہلاکت و

بربادی اور حزن و خسران سے بچنے اور دنیا و آخرت میں کامیابی کی بس یہی ایک راہ ہے تو خوب جان لو کہ پھر یہ راہ تو مکّہ کی گلیوں، طائف کے بازاروں، غارِ ثور اور بدر و حُنین کے میدانوں ہی میں سے گزر کر منزل تک پہنچتی ہے۔ اس لیے ان منازل میں سے گزرنے کی تیاری کیجیے، کتاب و سنّت میں مومنین، صالحین، صدیقین، شہداء اور اس راہ کے مسافروں کی جو صفات بتائی گئی ہیں ان کو اپنے اندر پرورش کیجیے، جو صفات منافقین، فاسقین اور ظالمین کی اور راہِ حق میں روک بننے والی بتائی گئی ہیں، اُن کو اپنے اندر سے دُور کیجیے، اپنے کردار، اعمال، اخلاق، معاملات اور عبادات ہر چیز کو خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنّت کی کسوٹی پر کس کر ان کی حقیقی قدر و قیمت معلوم کرتے رہیے اور اللہ کی راہ میں جان و مال کی ساری قوّتوں کے ساتھ جہاد کرنے کے جذبے، شوق اور ہمّت و حوصلے کو بار بار ناپ کر اپنے ایمان اور حُبّ اللہ کا اندازہ کرتے رہیے۔ آپ کا قلب خود بتاتا چلا جائے گا کہ آپ ایمان کے کس مقام پر ہیں؟

عبادت کی حقیقت

عبادت کے بارے میں یہ بات بھی اچھّی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ "عمل و عبادت" نام ہے ان تمام افعالِ انسانی کا جو ٹھیک ٹھیک احکامِ الٰہی کے مطابق کیے جائیں۔ عمل و عبادت اس کے علاوہ کسی اور شے کا نام نہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسری اصطلاحی عبادات بھی صرف

اسی صورت میں عبادات میں شمار ہوں گی جب کہ انہیں احکامِ الٰہی کے مطابق ٹھیک وقت پر، مقرر طریقے سے اور مطلوب نیّت کے ساتھ ادا کیا جائے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک کڑی بھی موجود نہ ہوگی تو قانون اور قاضی ممکن ہے ان کی صحت کا فتویٰ دے دیں مگر اللہ کے ہاں ان کا کوئی وزن نہ ہوگا[1]۔ اس بات کو آپ مندرجہ ذیل مثالوں سے اچھی طرح سمجھ لیں گے:

(۱) دیکھیے نماز کتنی بڑی عبادت ہے۔ مگر ذرا دو کے بجائے تین، تین کے بجائے چار یا چار کے بجائے پانچ رکعت ادا کریں، الحمد کی چھوٹی سی سورۃ کے بجائے کوئی بڑی سے بڑی سورۃ یا باقی پورا قرآن بھی پڑھ دیں، اللہ اکبر کے بجائے کوئی اور کلمہ کہہ دیں، بلا طہارت یا زوال کے وقت نماز ادا کریں یا کسی اور شرط کی خلاف ورزی کر دیں تو کیا یہ نماز

---

[1] وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ۔ (البقرۃ: ۱۹۸) اللہ کو اس کے بتائے ہوئے طریقے پر یاد کرو۔ اس سے پہلے تو تم لوگ قطعی طور پر گمراہ تھے۔ یعنی اگرچہ خدا کو یاد کرتے تھے لیکن وہ یاد چونکہ خدا کی ہدایت کے مطابق نہ تھی اس لیے اس کے باوجود تم گمراہ ہی تھے اور اگر تقویٰ و تقدّس کی کسی غلط فہمی میں مبتلا تھے تو یہ محض تمہارا فریبِ نفس تھا۔ پس جو لوگ شریعتِ الٰہی سے باہر خدا کا قرب تلاش کرتے ہیں یا اسے حاصل کر لینے کا گمان رکھتے ہیں ان کی تنبیہ کے لیے یہ آیت کافی ہونی چاہیے۔

عبادت میں شمار ہوگی ؟ ہرگز نہیں۔ اگرچہ آپ نے دس منٹ کے بجائے آدھ پون گھنٹہ اس میں صَرف کر دیا ہو۔

(۲) روزہ کتنی بڑی عبادت ہے۔ لیکن اگر اختتامِ سحری کے کچھ بعد تک کھاتے رہیں، افطار کے وقت بالارادہ تاخیر کر دیں، عید کے روز روزہ رکھ لیں، یا رمضان کے علاوہ مسلسل بلا ناغہ روزے رکھتے چلے جائیں تو کیا ایسے روزے عبادت میں شمار ہوں گے ؟ ہرگز نہیں۔ روزہ اسی صورت میں عبادت بنے گا جبکہ اسے ٹھیک خدا کے حکم کے مطابق رکھا جائے۔

(۳) زکوٰۃ کتنا بڑا احسان ہے، مگر بلا حساب بے وقت یا غیر مطلوب جگہ کوئی بڑی رقم دے دینا بھی، کیا زکوٰۃ کی ادائیگی کا قائم مقام ہو جائیگا؟ ہرگز نہیں، اگرچہ اس طرح زکوٰۃ کی واجب الادا رقم سے دس گنا زیادہ خرچ کر دیا جائے۔

(۴) حج کتنا بڑا ایثار ہے، مگر کسی کا مقرر ایام، مقرر طریق یا مقرر مناسک کی پابندی کیے بغیر مکّہ و مدینہ کا چکر کاٹ آنا یا مقرر ایام کے سوا اس کا سارا سال بھی ان تمام چیزوں کو ادا کرتے رہنا جو حج کے مناسک ہیں، کیا حج کے فرض سے اسے سبکدوش کر دے گا؟ ہرگز نہیں۔

یہ سب اس لیے کہ ہمارے قول و فعل اور ایثار و قربانی میں اصل چیز اور روحِ جوان کو مقبول بناتی ہے وہ صرف اللہ کی اطاعت کا جذبہ، اس کے احکام کی پابندی اور اس کی حدود کا پاس ہے، نہ ان حرکات کا فی نفسہٖ وجود۔ چنانچہ اگر تندرست اور توانا آدمی کے لیے کھڑے ہو کر نماز

پڑھنا اور رمضان میں روزے رکھنا عبادت ہے تو اس کے مقابلے میں ایک بیمار آدمی کے لیے بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز پڑھنا اور رمضان کے روزوں کو بعد کے لیے چھوڑ رکھنا عبادت ہے، اگر ایک سرمایہ دار اور صاحبِ ثروت آدمی کے لیے زکوٰۃ ادا کرنا عبادت ہے تو ایک ضرورت مند اور مستحقِ زکوٰۃ مسلمان کے لیے اس کا وصول کرنا بھی عبادت ہے۔ اگر ایک وقت کافی پانی موجود ہونے کی صورت میں وضو کر کے نماز ادا کرنا عبادت ہے تو دوسرے وقت جبکہ پانی صرف پینے ہی کے لیے کافی ہو سکتا ہو اور کہیں قریب میں ملنے کی بھی توقع نہ ہو تو تیمّم کر کے نماز پڑھنا عبادت ہے۔

اور پھر اللہ کی اطاعت، اس کے احکام کی پابندی اور اس کی حدود کا پاس زندگی کے جن جن کاموں میں داخل ہوتا جائے گا وہ سب عبادتِ الٰہی میں داخل ہوتے جائیں گے۔ حتیٰ کہ ایک کسان اگر دن بھر اللہ کے حدود کے اندر رہ کر سب کام کرتا ہے، وقت پر اُٹھتا ہے، وقت پر نماز ادا کرتا ہے، وقت پر ہل چلاتا ہے، وقت پر بیج ڈالتا ہے، وقت پر کھیتی کو کھاد اور پانی دیتا ہے، وقت پر بیلوں کو چارہ ڈالتا ہے، بچّوں سے پیار کرتا ہے، ان کی صحیح طریق پر پرورش اور تربیّت کرتا ہے، کسی سے خیانت اور کسی کی حق تلفی نہیں کرتا بلکہ اللہ اور اس کی مخلوق کے حقوق جو اس پر عائد ہوتے ہیں ان سب کو بس بھر ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی پوری زندگی عبادت ہے۔ حتیٰ کہ حقوقِ زوجیّت کی ادائیگی اور بقاءِ

نسل کے لیے اس کا اپنی بیوی کے پاس جانا بھی عبادتِ الٰہی میں داخل ہے،
ایسا ہی شخص دراصل اللہ کے ذکر میں ہر وقت مشغول ہے اور کسی دم اللہ
سے غافل نہیں ہوتا، اس کی زندگی وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا
لِیَعْبُدُوْنَ کا مکمل نمونہ ہے، نہ کہ اس شخص کی زندگی جو صبح سے شام تک
چند لفظوں کی رَٹ لگائے چلا جاتا ہے اور پوری دنیا پر غلبۂ کفر کو نہایت
اطمینان سے دیکھ رہا ہے، بلکہ اسی کے اندر عزّت و ترقّی کا خواہاں اور
ان کے لیے کوشاں ہے، ایسے شخص کو تو خدا کے رسول نے ایمان سے
خالی[1] قرار دیا ہے چہ جائیکہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ وہ بڑا صاحبِ
عمل اور خدا کا عبادت گزار بندہ ہے۔

رُوحانیّت کیا ہے؟

"عمل و عبادت" کے غلط مفہوم کے ساتھ "روحانیّت" کا ایسا غلط

---

[1] من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ ولیس وراء ذالک حبۃ خردل من الایمان۔ یعنی تم میں سے اگر کوئی بدی کو دیکھے تو چاہیے کہ اسے ہاتھ سے مٹا دے اور اگر ایسا نہ کر سکتا ہو تو زبان سے اس کے خلاف آواز اٹھائے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے (تو اس کے خلاف نفرت رکھے) اگر یہ بھی نہیں تو جان لو کہ اس کے بعد ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ یعنی ایسا دل نورِ ایمان ہی سے خالی ہے۔

اور گمراہ کن تصوّر رائج ہوگیا ہے جس نے مسلمانوں کی کثیر تعداد کو ایک سخت غلط فہمی میں ڈال رکھا ہے۔ اوّل تو حقیقت یہ ہے کہ کتابِ الٰہی اور حدیثِ رسول اس لفظ کے وجود ہی سے خالی ہیں۔ یہ کہیں بعد کی پیداوار ہے۔ وہاں تو صرف "ایمان" "اطاعت" "تقویٰ" "اتباعِ رسول" اور "خشیّت الٰہی" کی اصطلاحات ملتی ہیں۔ بہرحال روحانیّت کا اگر کوئی مفہوم ہے تو اس کے سوا کچھ نہیں اور نہ ہو سکتا ہے کہ انسان کی "رُوح" اس کی "حیوانیّت" پر اس طرح قابو پالے کہ پھر زندگی کے کسی گوشے میں بھی اس کی حیوانی خواہشات اور نفسانی جذبات کسی حال میں اس کی "رُوح" پر غالب نہ آسکیں، بلکہ اس کی "روح" اس کی ان خواہشات اور جذبات کو اس قدر زیر کرلے کہ کوئی بڑے سے بڑا خوف و لالچ یا نفع و نقصان بھی اسے اطاعتِ الٰہی اور حدود اللہ کی پابندی و احترام سے نہ ہٹا سکے اور وہ دنیا کی سب چیزوں سے بے نیاز ہو کر اپنا جان و مال اور سب کچھ جو اللہ نے اسے دے رکھا ہے دینِ حق کی سربلندی کے لیے وقف کردے۔ یہی کمال انسانیّت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسی کو انسان کے لیے فوزِ عظیم قرار دیا ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝ (۳۳ : ۷۱)

جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی راہ اختیار کرلی اس نے عظیم کامیابی حاصل کرلی۔

دوسری جگہ فرمایا :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ
تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝
تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ
وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ
بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ
ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ يَغْفِرْ
لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً
فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۝ ذٰلِكَ
الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

(۶۱ : ۱۱ - ۱۲)

اَے وہ لوگو! جو ایمان لائے
ہو کیا میں تمہیں عذابِ الیم سے
بچنے کا گُر بتا دُوں؟ اللہ اور اس
کے رسول پر ایمان لے آؤ، اور
اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور
مالوں سے جہاد کرو، فی الواقع
اگر تم سمجھو تو اسی میں تمہارے
لیے بہتری ہے۔ ایسا کرو گے
تو اللہ تمہاری لغزشوں کو معاف
کر دیگا اور تمہیں نعمت کے ایسے
باغوں میں لے جائیگا جن کے
نیچے نہریں بہہ رہی ہونگی اور
ان میں تمہارے لیے صاف
سُتھرے رہنے کے گھر ہونگے،

(اس راہ پر چلنا اور ان چیزوں کو پا لینا) یہ ہے سب سے بڑی کامیابی۔

اگر آپ کے رب کے نزدیک فوز و فلاح کی یہی راہ ہے تو آپ کس روحانیت کی تلاش میں ہیں، اس کا حکم تو یہ ہے۔ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ

یعنی اللہ کو اسی طرح یاد کرو جس طرح اس نے ہدایت کی ہے۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں موجودہ زمانے کے لوگ جس چیز کو روحانیت سے تعبیر کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی طرف بلا ارادہ کھنچتا چلا جائے اور یہ دراصل نتیجہ ہوتا ہے طبیعتوں کی مناسبت کا، اور اتحادِ مقصد اور اتحادِ عمل کا۔ جتنا زیادہ کوئی شخص دوسرے سے ان تینوں میں اشتراک رکھتا ہوگا اُسی قدر زیادہ اس کی طرف کھنچتا چلا جائے گا، ورنہ کیا بات تھی کہ خدیجۃ الکبریٰؓ اور ابوبکرؓ وہی بات سُن کر فوراً کچھ آتے ہیں، اور عمرؓ ایک عرصے تک کوئی اثر نہیں لیتے اور ابوجہل وہی بات عمر بھر سُنتا ہے مگر مخالفت ہی میں شدید تر ہوتا چلا جاتا ہے؟ اور اس وقت بھی کتنے کروڑ انسان ہیں جو گاندھی کے اشارے پر کٹ مرنے کو تیار ہیں، کتنے کروڑ ہیں جو ہٹلر اور سٹالن پر جان قربان کر رہے ہیں، کتنے کروڑ ہیں جنہوں نے سب کچھ چرچل اور روزویلٹ پر نثار کر دیا ہے؟ کیا یہی فراعنہ اس وقت دنیا میں صاحبِ روحانیت رہ گئے ہیں؟ اور پھر کیا وجہ ہے کہ ایک پیر صاحب کے مریدوں اور ایک جماعت کے ارکان کو اپنے ہی پیر یا رہنما کی طرف کشش محسوس ہوتی ہے؟ اور پھر کیا نوحؑ، مسیحؑ اور بعض دوسرے انبیاء علیہم السلام میں نعوذ باللہ روحانیت کی کمی تھی کہ چند انسانوں کے علاوہ کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے؟

اس سلسلے میں حضرت جنیدؒ کی زندگی کا ایک واقعہ بیان کر دینا

بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ کوئی شخص اُن کی ولایت اور بزرگی کا شہرہ سُن کر غالباً کچھ اسی قسم کی روحانیّت کی تلاش میں ان کے پاس آیا اور کچھ عرصہ اُن کی صحبت میں رہا۔ آخر جب واپس جانے لگا تو آپ نے پوچھا: "اب کیسے واپس جا رہے ہو؟" اس نے جواب دیا کہ "میں تو یہ سُن کر آیا تھا کہ آپ بڑے بزرگ اور صاحبِ روحانیت ہیں مگر میں نے تو کچھ نہیں دیکھا۔" حضرت جنیدؒ نے پُوچھا کہ "کیا میری کوئی بات کتاب وسنّت کے خلاف پائی؟" اس شخص نے جواب دیا کہ "نہیں ایسا تو نہیں پایا۔" آپ نے فرمایا: "تو بس جنیدؒ کے پاس تو یہی کچھ ہے۔"

پس معلوم ہُوا کہ "روحانیّت" کا یہ مفہوم لینا ہی سرے سے غلط اور گمراہی میں مبتلا ہونا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنا پُورا دین قرآن کریم میں بتا دیا اور اُس کے رسُولؐ نے اس کی عملی تشریح اپنی سنّت اور اسوۂ حسنہ میں فرما دی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ کو عقلِ سلیم اور اچھے اور بُرے کی تمیز دے دی گئی۔ اب جس کا جی چاہے یکسُو ہو کر اس راہ پر چل پڑے اور دنیا و آخرت کی بھلائی اور خدا کی خوشنودی حاصل کرے اور جس کا جی چاہے کوئی اور راہ اختیار کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص اللہ کی اطاعت و بندگی کو بالکلیہ اختیار کیے بغیر اور اس کے نفاذ کے لیے جدوجہد سے قطع نظر کر کے، محض کسی ٹونے ٹوٹکے یا ذہنی ورزش سے اللہ کی رضا جوئی اور اس کے ہاں فوزِ عظیم حاصل کر لینے کی غلط فہمی میں

مبتلا ہے تو اسے جان لینا چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسول کے ہاں اس کے لیے کوئی سند موجود نہیں۔ یہ کہہ دینا کہ اللہ کے نبی نے کچھ خاص باتیں یا نجات کا کوئی قریبی راستہ اپنے کسی خاص عزیز یا مخصوص گروہ کے چند لوگوں کو بتایا جو قرآن و حدیث میں نہیں آیا، ایک ایسا اتہام ہے جس کے بعد خدا کے رسول پر اس شخص کے ایمان کا کوئی سوال باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نعوذ باللہ رسول نے اپنے اس کام میں خیانت کی جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے منصبِ نبوّت عطا فرمایا تھا۔ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ط (۵ : ۶۷) (اے رسول! تیرے رب نے جو کچھ تیری طرف نازل کیا ہے اُسے (دُوسروں تک) پہنچا دے اور اگر تو یہ نہ کرے تو تُو نے گویا فرضِ رسالت ہی ادا نہیں کیا)۔ جو لوگ انبیاءؑ تک کے بارے میں اتنی بڑی جسارت کر ڈالیں ان کے شیطان کے ایجنٹ اور بندگانِ ابلیس ہونے میں کیا شبہ ہے؟ ہر شخص کے تقویٰ و بزرگی اور عمل و روحانیّت کو صرف کتاب و سنّت پر پرکھنے کی عادت ڈالیے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دوسروں کو پرکھنے کے بجائے خود اپنے آپ کو بار بار پرکھیے اور اپنے فرائض انجام دینے کی فکر میں لگے رہیے۔ کیونکہ ہر شخص کو دُوسروں کے کیے کی نہیں بلکہ صرف اپنے کیے کی جواب دہی کرنی ہے۔

لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ — ہر شخص جو کچھ کرتا ہے

اِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔

(الانعام : ۱۶۵)

اس کا ذمہ دار وہ خود ہی ہے۔ کوئی بھی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ؕ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝

(المدثر۔ ۳۷، ۳۸)

تم میں سے جس کا جی چاہے آگے بھی کچھ بھیجے اور جس کا جی چاہے سب کچھ یہیں دنیا میں چھوڑ جائے۔ بہرحال ہر شخص اپنے کیے کے بدلے میں رہن ہے۔ اس لیے اپنے عمل کا حساب چکائے بغیر نہیں چھوٹے گا۔

اسلام میں عزّت و سربلندی کا مفہوم

"عمل و عبادت" اور "روحانیّت" ہی کا نہیں، "عزّت و ذلّت" اور "سربلندی و پستی" کا مفہوم بھی اس زمانے میں سراسر اُلٹ گیا ہے۔ اس وقت سوسائٹی میں شرف و بزرگی اور عزّت و سربلندی کا واحد ذریعہ مال و دولت کی زیادتی اور مادی زور و اقتدار رہ گیا ہے۔ بلندیٔ اخلاق، پختگیٔ کردار، اور شرافتِ نفس، اور تقویٰ و طہارت کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہی۔ حد یہ ہے کہ ایک بدتر سے بدتر انسان جو شرابی، زانی، جوئے باز، مفسد، رشوت خور، بددیانت، مکّار اور حدود اخلاق کا علانیہ

توڑنے والا ہے، اگر مال و دولت اور کچھ وسائلِ زندگی رکھتا ہے تو وہی سوسائٹی میں معزّز و محترم اور ممتاز مانا جاتا ہے۔ اور ایک دوسرا شخص خواہ وہ کتنا ہی شریف النفس، صاحبِ خُلق و امانت، بلند کردار اور متّقی وخداترس ہو لیکن صرف اس لیے کہ مال و دولت میں دُوسروں سے کمتر ہے، سوسائٹی میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تہذیب وتمدّن کے اپنے سارے دعووں کے ساتھ پوری کی پوری دنیا اس وقت "لکشمی پوجا" میں بُری طرح مبتلا ہے۔ اب آپ کو اس بگڑی ہوئی ہوئی سوسائٹی کو از سرِ نَو صحیح بنیادوں پر قائم کرنا ہے۔ اور اس کے لیے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام میں شرف و بزرگی اور عزّت و سربلندی نہ مال و دولت میں ہے، نہ قوّت و غلبہ میں، نہ محلّات و باغات میں اور نہ وردی و تمغات میں، بلکہ صرف اس امر میں کہ کوئی شخص کتنا کریم النفس، بلند اخلاق، صاحبِ کردار، امانت دار اور خداترس ہے اور اللہ کی اطاعت و بندگی میں کس قدر بڑھا ہُوا ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (۴۹ : ۱۳) (اللہ کے ہاں معزّز وہ ہے جو تقویٰ اور خداترسی میں بڑھا ہُوا ہو)۔ ہاں ان کے ساتھ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے اسبابِ دنیا اور وسائلِ زندگی سے بھی نوازا ہو تو وہ اس کے لیے مزید عزّت و شرف کا موجب ہے۔ لیکن انسانی اوصاف سے قطع نظر کر کے ہر دو ٹنگے جانور یا انسان نما درندے کو محض اس لیے احترام کا مستحق قرار دے لینا کہ وہ ریشم و حریر میں ملبوس ہے یا شال و

پرنیاں کا جھول اس پر کسا ہوا ہے تو اس کی توقع احمقوں اور جانوروں ہی سے ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وہ بے چارے تو قہر و قوت کے مظاہرے ہی سے مرعوب اور متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن اگر انسان بھی انہی کو عزت و بزرگی کا معیار بنا لیں تو ان کو چاہیے کہ جنگل کے جانوروں سے جا ملیں۔ دراصل یہ اسی ذہنیت کا غیر شعوری نتیجہ ہے کہ جدید فلاسفہ کے ایک گروہ نے اپنا سلسلہ نسب بھی حضرت آدمؑ کے بجائے جنگل کے جانوروں ہی سے ملانے کی کوشش کی ہے۔ ایسے لوگوں کو انسان تو کیا اللہ تعالیٰ نے تو جانوروں سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا	ان کے پاس دل تو ہیں
يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ	لیکن ان سے سمجھنے کا کام نہیں
لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ	لیتے، ان کے پاس آنکھیں ہیں
آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ	لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں
أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ	لیتے، ان کے پاس کان (بھی)
هُمْ أَضَلُّ۔	ہیں لیکن ان سے سُننے کی خدمت
(اعراف: ۱۷۹)	نہیں لیتے۔ یہ نرے جانور ہیں،
	بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں۔

انسان کے لیے شرمناک بات یہ نہیں کہ وہ مزدوری کرتا ہے، ٹوکری اٹھاتا ہے، دکان لگاتا ہے، جوتے بناتا ہے، کپڑا بُنتا ہے، چھابڑی لگاتا ہے، بوجھ اُٹھاتا ہے یا کسی ایسی ہی چھوٹی موٹی صنعت سے روٹی کماتا

ہے، بلکہ اس کے لیے شرمناک یہ ہے کہ خواہشاتِ نفس کا بندہ بن کر اپنا دل و دماغ اور ایمان و اخلاق دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دے اور حرصِ دنیا سے اس درجہ مغلوب ہو جائے کہ جو پیشانی اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے ہی سامنے جُھکنے کے لیے بنائی تھی اسے وہ جانوروں سے بدتر انسانوں کے سامنے جُھکائے، جو زبان اس نے اپنی حمد و ثنا کے لیے دی تھی اس سے وہ غیر اللہ کی مدح سرائی اور خوشامد کرے، اور جو قوتیں اُس نے اپنا دین پھیلانے اور غالب کرنے کے لیے دی تھیں اُن سے وہ اشاعتِ کفر و ضلالت میں معاونت کرے اور پھر اسی کے معاوضے کو اپنا ذریعۂ معاش بنائے۔ جھوٹ بولے، چوری اور خیانت کرے، رشوت کھائے، دوسروں کے حق مارے، ظلم و زیادتی کرے اور خدا کی نافرمانی کے دوسرے کام کرے۔ غالباً ایسے ہی لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ذیل کی تمثیل بیان فرمائی ہے:

وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى	لیکن وہ تو زمین (نفع دنیا) ہی کی
الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ	طرف جھک کے رہ گیا اور اپنی خواہشات نفس
فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ	ہی کے پیچھے پڑا رہا حتیٰ کہ اسکی حالت
اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ	کتے کی سی ہو گئی کہ تم اس پر حملہ
اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ	کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے
مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا	اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے،
بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ	یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو

لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ط — ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں،
(اعراف : ۱۷۶) — (انکی خلاف ورزی کرتے ہیں)

مگر تم یہ حکایات ان کو سُناتے رہو، شاید کہ یہ کچھ غور و فکر سے کام لیں۔

پس سب شرف و بزرگی اور سارے فخر و امتیازات اس شخص کے لیے ہیں جو اللہ کے نزدیک بڑا ہے، اور اللہ کے نزدیک بڑا وہی ہے جو اس کی راہِ ہدایت کو اختیار کرے، اسی سے ڈرے، اور جس نے اللہ کی دی ہوئی ساری قوتوں اور قابلیتوں کو اسی کی راہ میں لگا دیا ہو۔ یہی فی الحقیقت معراج انسانی اور انسان کے لیے واحد سلامتی کی راہ ہے، قرآن کریم نے اسی بات کو اس طرح بیان کیا ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ج — اپنا حکم چلانا یہ صرف اللہ
اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ط — ہی کا حق ہے۔ بندوں کو تو
ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ز — اس نے یہ حکم دیا ہے کہ اس
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ — کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔
لَا يَعْلَمُوْنَ۔ — کیونکہ بندوں کے لیے صحیح طریقِ
(یوسف۔ ۴۰) — زندگی یہی ہے۔ مگر بہت سے
لوگ اس بات کو نہیں جانتے کہ ان کے لیے یہی سلامتی کی راہ ہے۔

مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ — جو شخص سرتاپا اپنے آپ
لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ — کو اللہ کی اطاعت میں دیدے

اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (البقرۃ : ۱۱۲)	اور پھر اس میں محسن بھی ہو یعنی اس جانفشانی کے ساتھ خدا کی اطاعت کرے، گویا کہ اللہ سر پر موجود ہر آن اسے دیکھ رہا

ہے، اس کے لیے اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف یا رنج کا کوئی اندیشہ نہیں۔

دینِ اسلام صرف مسلمانوں کا دین نہیں

یہ پوری نوعِ انسانی کا دین ہے

برادرانِ گرامی!

اسلام کسی قوم یا ملک کا دین نہیں ہے کہ یہ اس خاص قوم یا ملک ہی تک محدود رہے۔ یہ اللہ کا دین ہے، اس لیے یہ اس کی ہوا اور اس کے پانی کی طرح سے اس کی ساری مخلوق کی بھلائی اور فائدے کے لیے ہے۔ جس طرح اس کی ربوبیّت، اس کی رحمت اور دوسرے وسائلِ زندگی بلا تفریق رنگ و نسل سب انسانوں کے لیے یکساں ہیں، اسی طرح سے اس کی طرف سے آئی ہوئی راہِ ہدایت اور اس کا دین بھی بلا تفریق رنگ و نسل تمام بنی نوع انسان کے لیے یکساں ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے پوری نوعِ انسانی کو ایک ساتھ خطاب فرمایا ہے اور سب کے سامنے ایک ہی دلائل رکھے ہیں۔ کیونکہ خدا کی بے آمیز بندگی

(اسلام) کے سوا ان کے لیے کوئی اور راہِ عمل جائز اور درست نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کا سب سے پہلا خطاب ملاحظہ ہو:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا
رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ
الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ
فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ
بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا
لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ
اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ
وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا
نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا
بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ص وَ
ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ
دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ۝

(البقرہ : ۲۱ - ۲۳)

لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے
اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے
جو لوگ ہو گزرے ہیں ان سب کا
خالق اور پروردگار ہے۔ تمہارے
یہی روش اختیار کرنے سے اس
دنیا میں تمہارے غلط روی سے
اور آخرت میں اس کے عذاب سے
بچنے کی توقع کی جا سکتی ہے وہی
تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین
کا فرش بچھایا، آسمان کی چھت
بنائی، اوپر سے پانی برسایا اور
اس کے ذریعے سے طرح طرح
کی پیداوار نکال کر تمہارے لیے
رزق کا سامان کیا۔ ان سب
باتوں کو جانتے بوجھتے تو دوسروں
کو اللہ کے مدِ مقابل نہ ٹھیراؤ۔ اور
اگر تمہیں اس چیز (قرآن) کے خدا کی طرف سے ہونے میں کوئی شک

ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے، تو اس کی مانند تم کوئی
ایک سورۃ ہی بنا کر دکھا دو، اور اس کام کے لیے تم ایک اللہ کو چھوڑ
کر اپنے سارے حمائتیوں کو اپنی مدد کے لیے بلا لو۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو بھی کسی ایک قوم، ملک یا قطعۂ زمین کے بسنے والوں کی رہنمائی کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے رحمت (رحمۃ للعالمین) اور پوری نوعِ انسانی کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ اور اسے حکم دیا ہے کہ وہ اس حقیقت سے سب لوگوں کو آگاہ کر دے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۨ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِىِّ الْاُمِّىِّ الَّذِىْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

(الاعراف - ۱۵۸)

اے محمدؐ! نوعِ انسانی سے
کہہ دو کہ "اے لوگو! میں تم سب
کی طرف اللہ کی طرف سے رسول
بنا کر بھیجا گیا ہوں جو زمین اور
آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے،
اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہی
زندگی بخشتا ہے، وہی موت دیتا
ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس
کے بھیجے ہوئے نبی اُمّی پر جو اللہ
اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے۔ اور پیروی اختیار کرو اسکی، اس
طرح امید ہے کہ تم راہ راست پا لو گے۔

اور پھر اپنی کتاب کو بھی اُس نے سب انسانوں کے لیے یکساں نصیحت

اور ہدایت بنا کر بھیجا اور فرمایا :

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۝

(۸۱ : ۲۸)

(یہ قرآن) ساری دنیا کے لیے ایک نصیحت (حقیقتِ حال کی یاد دہانی) ہے۔ اب تم میں سے جو چاہے سیدھی راہ اختیار کرلے (اور جو نہ چاہے نہ کرے)۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۝

(۲۵ : ۱)

بہت بابرکت ہے وہ اللہ، جس نے حق اور باطل میں فرق کر دینے والی یہ کتاب اپنے بندے (محمدؐ) پر اُتاری تاکہ وہ دنیا والوں کو (حق و باطل) سے آگاہ کرے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ

(۲ : ۱۸۵)

رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن جیسی کتاب نازل کی گئی جو تمام انسانوں کے لیے سرتا سر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو صاف صاف راہِ راست کی طرف رہنمائی کرنیوالی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔

دینِ اسلام کو صرف مان لینا کافی نہیں ہے

اس کی تبلیغ اور اقامت بھی لازم ہے

یہ واضح کر دینے کے بعد کہ خدا کے دین اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کی دعوت تمام انسانوں کی طرف عام ہے اور وہ سب اس کے یکساں مخاطب ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس بات کو بھی بالکل واضح الفاظ میں فرما دیا ہے کہ اس کے دین کو صرف مان لینا کافی نہیں ہے۔ بلکہ جو لوگ اس کے حق اور انسان کے لیے واحد صحیح راہ ہونے کو تسلیم کریں، ان پر یہ فرض ہے کہ اسے اپنے اوپر اور اپنے گرد و پیش کی دنیا پر قائم اور برپا کرنے کی انتہائی جدوجہد کریں، اور اگر ضرورت پیش آئے تو اس راہ میں حائل ہونے والی قوتوں سے جہاد بھی کریں۔ اس کی مزید وضاحت کے لیے فرمایا کہ تم "مسلم" (خدا کے تابع فرمان) ہو۔ تمہیں ہم نے اپنے کام کے لیے منتخب کیا ہے اور تمہارا کام یہ ہے کہ اسلام کا جو عملی نمونہ ہمارے رسولؐ نے اپنی زندگی میں تمہارے سامنے پیش کیا، اسے تم اپنے دور کے لوگوں کے سامنے پیش کرو۔ چنانچہ رکوع و سجود اور نیکی اور بھلائی کے کاموں کی تاکید کرنے کے بعد فرمایا:

وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ	اللہ کی بندگی اور اس کی
حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ	رضاجوئی کی راہ میں جو قوتیں
وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ	مزاحم ہوں ان کے خلاف جہاد

مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ	کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔
اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰكُمُ	اس نے تمہیں اپنے کام کے لیے
الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَ	چن لیا ہے اور دین میں تم
فِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ	پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ یہ تمہارے
شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا	باپ ابراہیمؑ کا راستہ ہے اللہ
شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۔	نے پہلے بھی تمہارا نام "مسلم" رکھا
(۲۲ : ۷۸)	تھا اور اب اس (قرآن) میں

بھی تمہارا یہی نام ہے تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو (کہ جس طرح سے رسول نے دین تم کو پہنچایا تھا اسی طرح سے تم نے اپنے اپنے دور کے لوگوں کو پہنچا دیا۔)

یہاں یہ بات اچھی طرح سے سمجھ لینی چاہیے کہ خدا کے دین کے سلسلے میں جو اور جتنی ذمہ داری رسولؐ پر تھی وہی ذمہ داری اب قیامت تک کے لیے حضورؐ کی امت پر ہے۔ جس طرح سے قیامت کے روز رسولؐ کو اس امر کا ثبوت پیش کرنا ہو گا کہ اسؐ نے نہ صرف قولاً اس دین کی پوری تعلیمات کو ٹھیک ٹھیک امت تک پہنچا دیا بلکہ عملاً دکھا دیا کہ اسلام کے عقاید یہ ہیں، اخلاق، اطوار، تہذیب اور تمدن یہ ہیں، اس کی معاشرت، معیشت، سیاست اور عدالت کے ڈھنگ یہ ہیں، اس میں دوستی اور دشمنی کے حدود اور طریقے یہ ہیں، اس کا نظامِ مملکت یہ ہے اور اس کے تحت صلح و جنگ اور بین الاقوامی روابط و تعلقات کی صورتیں یہ ہیں، اسی طرح سے اُمّت

کو بھی خدا کے حضور یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اس نے بھی اپنے اپنے زمانے میں اپنی ہم عصر دنیا کے روبرو ان سب چیزوں کا عملی نمونہ پیش کر دیا تھا۔ اس کے بغیر چھٹکارا نہیں ہو سکے گا۔

یہ کام اس قدر ضروری، اہم اور بنیادی ہے کہ فرمایا :

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ	تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور
يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ	ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف
يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ	برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝	لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح
(۳ : ۱۰۴)	پائیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ اصلاً تو ساری امّت کی دوڑ دھوپ کا محور دعوت اِلی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہونا چاہیے۔ لیکن کچھ لوگ تو لازماً ایسے مقرّر ہونے چاہئیں جو اسی کام کے لیے وقف ہوں۔ باقی لوگ کم سے کم اس کام میں ان کے مددگار ہی ہوں اور ضروری وسائل و ذرائع اس کام کے لیے فراہم کریں۔

اس کام کی اہمیّت اور اس کے لزوم کا اندازہ اس امر سے بھی بآسانی کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کی غرض یہ بتائی ہے کہ :

اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى	اللہ نے اپنے رسول کو

وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔ (۶۱ : ۹)

دین حق اور ہدایت دے کر اس مقصد کے لیے بھیجا ہے کہ وہ اسے دوسرے تمام ادیان اور نظامہائے زندگی پر غالب کر دے۔

یہی نہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو دنیا میں جاری اور برپا اور دوسرے تمام نظام ہائے زندگی پر غالب کرنے کے لیے بھیجا تھا، بلکہ اللہ کا ہر رسول اسی مشن کو لے کر دنیا میں آیا۔ چنانچہ فرمایا:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ۔ (۴۲ : ۱۳)

تمہارے لیے بھی وہی دین (نظام زندگی) مقرر کیا گیا ہے جو نوحؑ کو دیا گیا تھا۔ (یہی نہیں بلکہ) جو دین تمہاری طرف وحی کیا گیا ہے، یہی ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا تھا (سب کو اسی بات پر مامور کیا گیا تھا) کہ اس دین کو قائم اور برپا کرو۔

اگر خدا کا دین قائم نہ ہو اور اس پر کوئی دوسرا نظام زندگی یا نظریہ حیات غالب ہو تو خدا کے نزدیک یہ فتنہ و فساد کی صورت ہے جسے دُور کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ جو لوگ اس فرض کو انجام نہیں دیتے ہیں اُن کو اللہ تعالیٰ آخر کار ملیامیٹ کر دیتا ہے۔ فرمایا:

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۔(۲ : ۱۹۳)

تم اُن سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔

صاف واضح ہے کہ اگر اللہ کا دین غالب نہ ہو تو خدا کے نزدیک یہ فتنے کی حالت ہے جسے ختم کرنے کی امکانی کوشش کرنا ضروری ہے۔

پھر پچھلی مسلمان امّتوں کی اس فرض میں کوتاہی اور اس کی پاداش میں ان کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ۝ (۱۱ : ۱۱۶ - ۱۱۷)

پھر کیوں نہ ان قوموں میں جو تم سے پہلے ہو گزری ہیں ایسے اہلِ خیر موجود رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے۔ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت تھوڑے جن کو ہم نے ان قوموں میں سے بچا لیا۔ ورنہ ظالم انہی مزوں کے پیچھے پڑے رہے جن کے سامان ان کو فراوانی کے ساتھ دیئے گئے تھے اور وہ مجرم بن کر رہے۔ تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ناحق تباہ کر دے حالانکہ ان کے باشندے اصلاح میں لگے ہوں۔

پس اہلِ ایمان کا یہ فرض ہے کہ خدا کے دین کو غالب اور مکمّل صورت میں برپا کرنے کی امکانی کوشش کریں۔ اگر کوئی کوشش اس کے لیے ان کے گردوپیش ہو رہی ہے تو اپنے تمام وسائل اور ساری قوّت اور قابلیّت کے ساتھ اس کا ساتھ دیں۔ اگر نہیں ہو رہی یا ہو رہی ہے لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں تو خود اس کے لیے اٹھیں اور بہتر طریق پر اس فریضہ کو انجام دینے کی کوشش کریں۔ بہرحال اس سے پہلو تہی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کا جو انجام ہے اس سے ڈراتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ	بچو اس فتنے سے جس کی شامت
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۚ	مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ	تک محدود نہ رہیگی جنہوں نے
الْعِقَابِ ۝	تم میں سے گناہ کیا ہو اور جان
(۸ : ۲۵)	رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

اور یہ صورت رُونما کب ہوتی ہے۔ اس بارے میں فرمایا کہ:

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ	آخر کار جب انہوں نے ان
اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ	ہدایات کو بھلا دیا جو انہیں یاد
السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ	کرائی گئی تھیں تو ہم نے ان لوگوں
ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَئِيْسٍ	کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے
بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ (۷:۱۶۵)	اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے

ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا۔

یعنی بچایا صرف ان لوگوں کو گیا جو اصلاح کی کوشش کرتے رہے۔ دوسرے سب عذاب میں پکڑ لیے گئے۔ وہ بھی جو بالفعل برائیوں میں مبتلا تھے اور وہ بھی جو اگرچہ خود برائیوں میں مبتلا نہ تھے۔ لیکن دوسروں کو برائی سے روکتے نہیں تھے۔ اسی بات کو حضور نبی کریمؐ نے وضاحت کے ساتھ اس طرح فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُعَذِّبُ الْعَامَّۃَ بِعَمَلِ الْخَاصَّۃِ حَتّٰی یَرَوُا الْمُنْکَرَ بَیْنَ ظَھْرَانَیْھِمْ وَھُمْ قَادِرُوْنَ عَلٰی اَنْ یُّنْکِرُوْہُ فَلَا یُنْکِرُوْہُ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِکَ عَذَّبَ اللّٰہُ الْخَاصَّۃَ وَالْعَامَّۃَ۔

یعنی اللہ تعالیٰ خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو عذاب نہیں دیتا جب تک کہ لوگوں کی یہ حالت نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے بُرے کام ہوتے دیکھیں اور وہ ان کو منع کرنے اور ان کے خلاف اظہارِ ناراضی کرنے کی قدرت رکھتے ہوں اور پھر بھی نہ ان کو روکیں اور نہ ان پر اظہار ناراضی کریں۔ جب لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے تو اللہ بلاتمیز خاص و عام سب کو عذاب میں پکڑ لیتا ہے۔ اَللّٰھُمَّ نَعُوْذُ بِکَ مِنْ ذَالِکَ۔

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے

یہ بات روزِ روشن کی طرح سے واضح ہوجاتی ہے کہ دینِ اسلام کو صرف شخصی طور پر مان لینا ہرگز کافی نہیں ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امّت ہونے کی حیثیت سے ہم پر واجب ہے کہ نہ صرف اس کی تبلیغ واشاعت کریں بلکہ اس کی اقامت کی جدوجہد میں جان ومال کی بازی لگا دیں۔ کیوں کہ اس کے بغیر نہ دینِ حق پر ایمان لانے کا حق اَدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی نجات ممکن ہے۔

غیر مُسلموں کیلئے اِسلام کا پیغام

آخر میں مَیں چند گزارشات غیر مسلم بھائیوں کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ہمارا فرض ہے کہ اس "دعوتِ حق" کو اپنے غیر مسلم بھائیوں کے سامنے بھی پیش کریں، اور پُوری برادرانہ ہمدردی سے انہیں سمجھائیں کہ بھائی یہ "اسلام" ہماری یا کسی اَور کی کوئی ذاتی میراث نہیں ہے۔ یہ تو ہم سب کی مشترکہ چیز ہے۔ یہ بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے ہم سب کے رب کے بتائے ہوئے چند اُصول ہیں جنہیں اختیار کر کے انسان دنیا و آخرت دونوں جگہ فلاح ونجات پا سکتا ہے۔ اگر انہیں قبول کر لو تو آپ کی اپنی بھلائی ہے۔ اور اگر انہیں قبول نہیں کرتے تو ان اصُولوں کا یا کسی اَور کا تو کچھ نہیں بگڑتا۔ خود اپنے آپ ہی کو خسران میں ڈالتے ہو۔ اپنے سامنے پھیلی ہوئی خدا کی اس کائنات کا کھُلی آنکھوں اور کھلے دل سے مشاہدہ کیجیے۔ ہر شے

اصل حقیقت کی نشاندہی کرتی چلی جائے گی۔

چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ سورج، چاند اور ستارے، یہ آگ، پانی اور ہوا، یہ پھل پھول اور نباتات، یہ لوہا، سیسہ اور ساری کی ساری جمادات اور اس زمین و آسمان کی ایک ایک چیز ایک زبردست قاعدے اور قانون میں جکڑی ہیں، جس کے خلاف وہ بال برابر بھی جنبش نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ آپ کے ہاں یہ دن رات اور مہینوں کی آمد و رفت اسی پر تو موقوف ہے۔ کہ سورج چاند اور زمین ایک زبردست قانون کے ماتحت بلا چون و چرا اپنے اپنے راستے پر اپنی مقرر رفتار کے ساتھ مسلسل چلے جا رہے ہیں، آپ کے پھل پھول اور باغات کی ساری رونق اسی بات کی تو مرہونِ منت ہے کہ زمین کی ہر پیداوار مختلف موسموں، اقسامِ زمین اور آب و ہوا کی اس طرح پابند بنا دی گئی ہے کہ ہر شے اپنے موسم، اپنے لیے مقرر قسم کی زمین اور آب و ہوا میں بے چون و چرا پیدا ہوتی، نشو و نما پاتی اور پروان چڑھتی چلی جاتی ہے۔ آپ کی یہ ساری صنعتی ترقیاں اور کارخانے اسی وجہ سے تو ممکن ہوئے کہ ساری جمادات، آگ، پانی، بجلی اور دوسری سب اشیاء اور قوتیں جو اس کام کے لیے درکار ہیں اٹل اور بالکل معیّن قوانین طبیعی اور کیمیاوی کی بے عذر اطاعت پر مجبور کر دی گئی ہیں، اور آپ کے اسکول، کالج اور ہسپتال اسی یقین پر تو قائم ہوئے ہیں کہ اس کائنات کی ساری چیزیں کچھ قطعی اصولوں اور قوانین کی پابند ہیں۔ جن کے مطابق کام کر کے ہر شخص اور ہر قوم ان سے یکساں فائدہ اٹھا سکتے

ہیں۔ پھر جو لوگ سائنس اور اس کے علوم سے کوئی واقفیت رکھتے ہیں وہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ انسان کے یہ سارے مایۂ ناز علوم خواہ وہ

علم الطبیعیات Physics ہو یا علم الکیمیا Chemistry

حیوانیات Zoology ہو یا حیاتیات Biology

علم الابدان Physiology ہو یا علم الادویہ Medicine

فلکیات Astronomy ہو یا ارضیات Geology

زراعت ہو یا انجینئرنگ یا کوئی اور شعبۂ علم، سب خالقِ کائنات ... Nature کے ان اٹل، اٹوٹ اور قطعی قوانین وضوابط کے مجموعوں پر مشتمل ہیں جو اب تک انسان کے علم میں آسکے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک اصول یا قانون وضابط بلکہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا جز بھی کسی سائنسدان، ڈاکٹر، انجینئر، بڑے سے بڑے کاریگر یا ماہرِ فن کا مقرر کردہ نہیں ہے۔ سائنسدان اور دوسرے سارے ماہرین فن ان اصولوں اور قوانین کو بناتے یا وضع نہیں کرتے، بلکہ صرف معلوم Discover کرتے ہیں کہ فلاں معاملے میں قانونِ طبعی Law of Nature کیا ہے۔ نیوٹن Newton گیلیو Galileo کوپرنیکس Copernicus رتھرفورڈ Rutherford یا آئنس ٹائن Ein stein اور دوسرے سائنسدان سب اس کائنات میں جاری بعض قوانینِ قدرت کو معلوم ہی کرنے والے تھے۔ کوئی بھی اپنے معلوم کردہ قوانین کو مقرر اور وضع کرنے والا نہیں تھا اسی

طرح سے یہ کیمسٹ اور دواساز، دواسازی اور مرکّبات تیار کرنے کے طریقے وضع اور ان کی تاثیریں متعیّن نہیں بلکہ صرف تحقیق ہی کرتے ہیں، ڈاکٹر لوگ بھی بیماری دُور کرنے کے طریقے اور حفظانِ صحت کے اصول مقرّر و معیّن نہیں صرف معلوم ہی کرتے ہیں۔ آپ کے انجینئر بھی مکینکس اور مشین سازی کے اصول و قواعد بناتے نہیں، معلوم ہی کرتے ہیں اور آپ کے ماہرانِ فلکیات ارضیات، حیوانیات اور حیاتیات وغیرہ سب کائنات کے ان مختلف محکموں کے لیے ضابطے اور قوانین بناتے نہیں بلکہ ان کا علم ہی حاصل کرتے ہیں۔

پھر اس بات سے بھی مجالِ انکار نہیں کہ ان سب قوانین و ضوابط کی تعیین و ترتیب یا باہم تعلق میں کسی عام انسان کو تو کیا دخل ہوگا، کسی بڑے سے بڑے بادشاہ، ڈکٹیٹر، صدر جمہوریہ یا کسی پیر، پادری، پنڈت، پروہت یا سارے بنی نوع انسان کو اپنے سب ساز و سامان سمیت بھی کوئی دخل نہیں۔ بلکہ سُورج سے لے کر ریت کے ذرّوں تک، بڑے سے بڑے بادشاہ اور ڈکٹیٹر سے لے کر ایک حقیر چیونٹی تک اور انبیاء و صلحاؑ سے لے کر فسّاق و فجّار تک سب کے لیے یہ یکساں طور پر نافذ العمل اور اٹل ہیں۔

اور پھر آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں ان قوانین سے انحراف اور ان کی خلاف ورزی ہی کا دُوسرا نام بگاڑ ہے۔ مثلاً آپ ذرا مشینی ضوابط Laws of mechanics کی خلاف ورزی کیجیے وہیں آپ

کی مشین کا ستیاناس ہو جائے گا، حفظانِ صحت کے اصُولوں کو توڑیئے آپ کی صحت و تندرستی رخصت ہو جائے گی۔ قوانینِ زراعت کی پابندی میں کوتاہی برتیے، آپ کے سب پھل پھول اور پودے برباد ہو جائیں گے، حتیٰ کہ زندگی کے کسی گوشے میں بھی قوانینِ فطرت کو ذرا نظر انداز کر کے دیکھیے وہیں بگاڑ کی شکل سامنے آجائے گی۔ یہی نہیں بلکہ ہر مشین کی کارگزاری Efficiency صحت کی درستی، فصل کی افزونی اور دنیا کی ہر چیز کی ترقّی اسی پر موقوف ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اس ضابطے کے مطابق ہو جو اس کے لیے مقرّر کر دیا گیا ہے۔ جو جس قدر زیادہ ان قوانین و ضوابط اور اصُولوں کو جانے اور برتے گا اسی قدر اس کو اس دنیا میں کامیابی اور ترقی اور اس کے ذرائع و وسائل پر تسلّط و تصرّف حاصل ہوتا چلا جائیگا۔ اس طرح سے کم سے کم طبعی زندگی کی حد تک یہ بات تجربے سے ثابت ہو جاتی ہے کہ ترقّی وارتقاء اور کامیابی اور غلبہ نام ہی قوانینِ قدرت کو ٹھیک ٹھیک جاننے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا ہے۔ اور یہ قوانین و ضوابط سب اس خدا کے بنائے ہوئے اور جاری کردہ ہیں، جس نے اس کائنات کو بنایا ہے۔

جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے اپنی باقی کائنات اور اس کی ایک ایک چیز کے لیے اور خود انسان کے طبیعی اور تکوینی زندگی کے لیے اٹل قوانینِ فطرت Laws of Nature. بنا دیئے ہیں جن کی پابندی اور پیروی ہی میں انسان کے لیے امن و فلاح اور ترقی وارتقا ہے، عین اسی

طرح سے انسان کے اخلاقی، سماجی اور اجتماعی زندگی کے لیے بھی اللہ تعالےٰ کے مقرر کردہ اٹل اور قطعی قوانین اور اصول وضوابط موجود ہیں۔ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ یہ کارخانہ عالم چونکہ طبعی قوانین کے تابع چل رہا ہے۔ اس لیے ان قوانین کی خلاف ورزی کا بُرا نتیجہ تو فوراً سامنے آجاتا ہے۔ لیکن اخلاقی اور اجتماعی زندگی سے متعلق قوانین الٰہی کی خلاف ورزی کا بُرا انجام ہمیشہ فوراً ظاہر نہیں ہوتا اور بعض اوقات اس دنیا میں سرے سے ہی ظاہر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں تک اوّل الذکر یعنی قوانین طبعی کا تعلّق ہے ان کو معلوم کرنے کا کام خود انسان ہی کے علم و تجربہ اور تحقیق پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ لیکن اخلاقی اور اجتماعی زندگی سے متعلق قوانین الٰہی کی تعلیم اور تبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ نے کمال مہربانی سے کام لیتے ہوئے ہر ملک اور ہر ملک میں اپنے نبی اور رسول مقرر فرمائے، جنہوں نے نہ صرف یہ کہ خدا کی ساری کی ساری تعلیمات من وعن اور بلاکم وکاست اپنے اپنے لوگوں تک پہنچا دیں، بلکہ ان میں سے ایک ایک چیز پر عمل کر کے بھی دکھا دیا۔ اور تاریخِ عالم گواہ ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں "نظامِ زندگی" انبیاء کے بتائے ہوئے اصولوں پر قائم ہوا یہ زمین جنّت کا نمونہ اور امن وسلامتی کا گہوارہ بن گئی۔ چنانچہ ہر قوم اور ہر ملک کے لوگوں میں جس گزشتہ "سنہری زمانے" کے قصّے اور کہانیاں اب تک کم و بیش چلے آتے ہیں یہ سب دراصل اسی زمانے سے متعلق ہیں جبکہ اُس قوم یا ملک کی زمامِ کار اور انتظامِ ملکی اللہ کے ان برگزیدہ بندوں یا ان کے ماننے والوں

کے ہاتھ میں تھی، یا پھر ان کے بتائے ہوئے اصولوں کے بیشتر حصّہ کو لوگ ابھی عملاً اختیار کیے ہوئے تھے۔

اللہ کے ان سب نمائندوں نے اپنے اپنے وقت میں ہر جگہ لوگوں کو غیر اللہ کی بندگی سے نکال کر ایک الٰہ حقیقی اور مالکِ کُل کی اطاعت و بندگی پر جمع کیا اور انہیں بتایا کہ اس الٰہ واحد کو چھوڑ کر جن جن کی بھی تم اطاعت و بندگی کرتے ہو وہ سب تمہاری طرح اس کے بندے اور غلام ہوں۔ زمان و مکان اور انسانی زندگی کے مختلف ادوار میں تمدّن کے فرق کی بنا پر بعض تفصیلات کے سوا ان سب کی ایک ہی تعلیم تھی اور وہ یہ کہ "یہ چاند، یہ تارے، یہ زمین و آسمان کی ساری قوتیں ایک خدا کی مخلوق ہیں۔ وہی تمہارا پیدا کرنے والا ہے، وہی رزق دینے والا ہے، وہی مارنے اور جلانے والا ہے، سب کو چھوڑ کر اسی کو پوجو، سب کو چھوڑ کر اسی سے اپنی حاجتیں طلب کرو، یہ چوری، لوٹ مار، یہ شراب خوری، یہ جوا، یہ بدکاریاں جو تم کرتے ہو، سب گناہ ہیں، انہیں چھوڑ دو۔ خدا انہیں پسند نہیں کرتا۔ سچ بولو، انصاف کرو۔ نہ کسی کی جان لو، نہ کسی کا مال چھینو۔ جو کچھ لو حق کے ساتھ لو، جو کچھ دو حق کے ساتھ دو۔ تم سب انسان ہو، انسان اور انسان سب برابر ہیں۔ بزرگی اور شرافت انسان کی نسل اور نسب میں نہیں، رنگ و روپ اور مال و دولت میں نہیں، خدا پرستی، نیکی اور پاکیزگی میں ہے۔ جو شخص خدا سے ڈرتا ہے اور نیک و پاک ہے وہی اعلیٰ درجہ کا انسان ہے اور جو ایسا نہیں وہ کچھ بھی نہیں۔

مرنے کے بعد تم سب کو اپنے خدا کے پاس حاضر ہونا ہے۔ اس عادلِ حقیقی کے ہاں نہ کوئی سفارش کام آئے گی، نہ رشوت چلیگی، نہ کسی کا نسب پوچھا جائے گا، وہاں صرف ایمان اور نیک عمل کی پوچھ ہوگی۔ جس کے پاس یہ سامان ہوگا وہ جنّت میں جائے گا اور جس کے پاس ان میں سے کچھ نہ ہوگا وہ نامراد دوزخ میں ڈالا جائے گا۔[1]

اللہ کے سب نبیوں نے بلا استثناء اس کے بندوں کو دین کی یہی تعلیم دی۔ یہ اختلافات جو آپ پا رہے ہیں، شریر اور دنیا پرست لوگوں کی تحریف وتصرف کا نتیجہ ہیں۔ غور فرمائیے کہ جس خداوند تعالیٰ نے انسان اور انسان کے درمیان ـــــ زمین و آسمان کی ساری قوّتوں، دنیا کے بے شمار خزانوں، زندگی کے بے حد و حساب ذرائع و وسائل میں سے ـــــ کسی ایک چیز کی تقسیم میں بھی نام و نسب یا نسل کی بنا پر کوئی فرق نہ کیا ـــــ قوانینِ طبعی، ضوابطِ ارضی و سماوی، قواعدِ صحت، اصول ہائے زراعت اور انسانی ضروریات زندگی کی کسی ایک شے میں بھی جس کی تخلیق و تقسیم انسانی دسترس سے باہر ہو، رنگ رُوپ یا نسب و وطن کی بنا پر کوئی امتیاز نہ برتا ـــــ اس نے دیکھنے اور سُننے کی قوّتوں، سوچنے اور سمجھنے کی قابلیّتوں، ترقی و برتری کی صلاحیّتوں، اور انسانی عقبات اور کمزوریوں کے ودیعت کرنے میں امیر و غریب یا نیک و بد کا کوئی لحاظ نہ کیا، اور ـــــ ہر جگہ، ہر قوم،

---

[1] ۔۔ دینیات از مولانا سید ابُوالاعلیٰ مودودی، مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور۔ صـ۶۴

اور ہر طبقہ کے لوگوں کی خدمت وچاکری کے لیے زمین وآسمان کی ساری قوتوں کو یکساں مسخر اور تابع بنایا ـــــ بادل پانی برسائے تو سب کے لیے، سورج گرمی پہنچائے تو سب کے لیے، مٹی رزق اور لباس اُگلے تو سب کے لیے، پانی پیاس بجھائے تو سب کی، اور پٹرول موٹر چلائے تو سب کی، ایسے عادل ومنصف خدا کے متعلق کون احمق یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ تمام گورے اور کالے، امیر وغریب اور نیک وبد انسانوں کو ایک سی خواہشات وضروریات، ایک سے جذبات واحساسات اور ایک سی فطرت دینے کے باوجود صرف اختلافِ ملک وقوم یا زمانہ کی بنا پر اس نے مختلف لوگوں کو مختلف "دین" (تشکیل وتعمیر سوسائٹی کے طریقے/تعلیم کیے ہوں گے، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، حقیقت یہی ہے کہ "دین" ہر جگہ اور ہمیشہ ایک ہی آتا رہا ہے۔ عقلِ سلیم اس کا مطالبہ کرتی ہے اور قرآن کریم (اللہ کی آخری محفوظ اور مستند کتاب) اس کی تائید کرتا ہے۔ اور گزشتہ مذاہب میں بہت سی تعلیمات کا اللہ کے دین کے آخری مستند ایڈیشن (اسلام) سے مطابقت رکھنا اور من حیث المجموع اللہ کی بندگی کی طرف انسان کو بُلانا اس امر کی صریح دلیل ہے کہ دراصل سب مذاہب ایک ہی "دینِ حق" کی بگڑی یا بگاڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ اور اس سے کوئی صاحبِ علم وعقل انکار نہیں کر سکتا کہ آسمانی کتب میں سے صرف قرآنِ کریم اور اللہ تعالیٰ کے نمائندگان فی الارض (انبیاء ورسل) میں سے صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سیرت ورہنمائی اس وقت دنیا میں

بلاکم و کاست محفوظ ہیں۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ جہاں گزشتہ انبیاء علیہم السّلام کے اُسوہ اور ان کی تعلیمات کا اس وقت صحیح صحیح موجود ہونا تو درکنار، اس کے دو چار سو سال بعد بھی ان کے ٹھیک ٹھیک دنیا میں موجود ہونے کا ثبوت نہیں ملتا وہاں گزشتہ تیرہ چودہ سو سال کے نشیب و فراز اور "مسلمان قوم" کی ساری نالائقیوں اور گمراہیوں کے باوجود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت آئی ہوئی پوری کی پوری تعلیمات آج بھی اُسی طرح موجود و محفوظ ہیں جس طرح نبی اکرمؐ نے انہیں چھوڑا تھا۔ اور یہ کوئی اتفاقِ زمانہ کی بات نہیں، قرآنِ کریم نے بتا دیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی، قرآن اللہ کی آخری کتاب، اور یہ دونوں آئندہ ہمیشہ کیلیے ہدایت کا واحد ذریعہ ہیں اور اس نورِ ہدایت کو متلاشیانِ حق کے لیے قیامت تک محفوظ رکھنے کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لے لیا ہے۔ اس بات کا ثبوت کہ یہ بات برحق ہے، کہیں باہر سے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ کتاب و سنّت کا ایک ایک شوشہ آپ کی آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔

یہی وجہ ہے کہ "طالبانِ حق" کے لیے اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ دوسرے تمام منبع ہائے ہدایت (جنہیں لوگوں نے اپنی تحریف و تصرف سے گدلا کر دیا ہے) کو چھوڑ کر صرف قرآن کریم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی طرف رجوع کریں، اور انہی دونوں سے رہنمائی حاصل کریں۔ اس اختلافِ مذہب کو دُور کرنے کے لیے ہی تو اللہ تعالیٰ

نے سابقہ تعلیمات کو جو مختلف اقوام اور مختلف ممالک میں ابتدا سے وقتاً فوقتاً نازل کی جاتی رہی تھیں یک جا کر کے قرآنِ کریم اور خاتم النبیینؐ کی سیرۃ مقدسہ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا، اور بتا دیا کہ اللہ کی طرف سے آنے والے سب ہادیوں کی یہی تعلیم تھی، وہ سب اللہ کے سچے پیغامبر اور برگزیدہ بندے تھے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان سب کو سچا تسلیم کرنا اور ان پر ایمان لانا مسلمان ہونے کے لیے لازمی شرط ہے، اور ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار انسان کو دائرۂ حق پرستی سے خارج کر دیتا ہے۔

پس ہم لوگ جو قرآنِ مجید اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور ان کے عمل کو اب واحد سرچشمۂ ہدایت کے طور پر پیش کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم خدانخواستہ خدا کے دوسرے رسولوں کے خلاف کسی تعصب میں مبتلا ہیں۔ ایسی کسی بات کا ادنیٰ ارتکاب بھی ہمارے نزدیک کفر میں مبتلا ہونا ہے۔ ہم یہ بات صرف اس لیے کہتے ہیں کہ مذکورہ چشمۂ ہدایت کے سوا کسی اور نبی اور رسول کی تعلیم اپنی اصل اور بے آمیز صورت میں موجود ہی نہیں ہے۔ خدا کے دین اور اس کے تعلیم کردہ ضابطہ حیات کو معلوم کرنے کی اب ایک ہی ممکن صورت ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید اور سنتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا جائے۔ جو لوگ اس راہ کو چھوڑ کر اپنی یا دوسروں کی خواہشاتِ نفس پر چل رہے ہیں، ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ خدا کے رسول تو انسانوں

کو بہت سے خداؤں کے بجائے ایک خدا کی بندگی اور حق پرستی، عدل و انصاف، سچائی، امانت و دیانت، پاکیزہ عائلی زندگی اور امن و سلامتی کے ساتھ رہنے سہنے کی تعلیم دیتے ہیں، وہ بتائیں کہ کیا رب کے بجائے بہت سے رب، حق کے بجائے باطل، سچائی کے بجائے جھوٹ، عدل و انصاف کے بجائے ظلم و ستم، امانت و دیانت کے بجائے خیانت و بے ایمانی، نکاح کے بجائے زنا، امن و سلامتی کے بجائے فتنہ و فساد یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ انبیاء و صلحاء کی رہنمائی اور طریقِ زندگی کے بجائے مفسد اور مار دھاڑ کرنے والے لوگوں کی رہنمائی اور ان کے طریقِ زندگی کو اختیار کرنا کچھ بھی قرینِ عقل و انسانیت ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو کم سے کم "دینِ حق" اور اس کے لانے والے کی سیرت سے واقف ہونے کی تو تکلیف فرمائیے۔ کسی بات یا طریقے کو قبول یا ردّ کرنے کا سوال تو بعد میں پیدا ہوتا ہے لیکن اس طرزِ عمل کو آپ کیسے صحیح کہہ سکتے ہیں کہ انسان پرائے شگون کے لیے اپنی ناک کٹوا دے اور بھلائی کو صرف اس لیے جاننے کی بھی کوشش نہ کرے کہ ایک دوسرا شخص بھی (جس سے اسے کسی بنا پر نفرت ہو گئی ہے) وہ اسے اختیار کیے ہوئے ہے؟ کیا آپ اس تعصّب کی وجہ سے جو ہندوستان کی[1]

---

[1] یہ بات پیشِ نظر رہے کہ یہ مضمون اس زمانے کا ہے جبکہ ابھی ہندوستان تقسیم نہیں ہوا تھا۔ بلکہ تقسیم کی توقع بھی پیدا نہ ہوئی تھی۔

"مسلم قوم" سے آپ کو دنیاوی اغراض کے لیے تمدنوں کی کش مکش سے پیدا ہو گیا ہے، ان سب سچائیوں اور بھلائیوں کو چھوڑ دیں گے جنہیں ان مسلمانوں نے اختیار کر رکھا ہے یا جن کی نسبت انہوں نے اپنی طرف کر رکھی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کو تو کوئی عاقلانہ رویّہ نہیں کہا جا سکتا۔ نیکی اور بھلائی اور فلاح کی راہ تو انسان کو دوست دشمن جہاں سے ملے حاصل کرنی چاہیے، اور پھر جب مسلمانوں سے تعصّب کی بنا پر آپ نے وہ پانی پینا نہیں چھوڑا جو مسلمان پیتے ہیں، وہ رزق کھانا نہیں چھوڑا جو مسلمان کھاتے ہیں، زراعت، حفظانِ صحت، سائنس اور دوسرے قوانینِ طبعی اور وہ کاروبار کے اصول نہیں چھوڑے جو مسلمان استعمال کرتے ہیں تو آخر انسانی فلاح کے ان اصولوں جن کا نام عربی زبان میں "اسلام" یعنی اللہ کی اطاعت پر مبنی نظامِ زندگی ہے، صرف اس بنا پر کیوں چھوڑ رہے ہو کہ مسلمانوں نے اسے اپنا دین کہنا شروع کر دیا ہے۔ اور وہ بھی اسے اختیار کیے ہوئے ہیں؟

"اسلام" کسی کی آبائی جائداد نہیں، یہ تو اُسی کا ہے جو اس پر چلے۔ ہندوستان کے لوگ اس پر چلیں تو ان کا ہے، عرب کے چلیں تو ان کا ہے، اور یورپ کے لوگ اسے اختیار کر لیں تو ان کا ہے۔ عبداللہ، رام داس یا کرتار سنگھ کسی سے بھی ملک، قوم یا خاندان کی بنا پر اسے کوئی تعلق یا نفرت نہیں، اسے تو بس ان لوگوں کی ضرورت ہے جو اس راہ پر چلنے والے ہوں۔ خواہ اُن کا کوئی ملک، قوم، یا رنگ یا خاندان ہو، حد یہ ہے کہ کسی بُت گر

کافر کا بیٹا اسے اختیار کرلے تو خلیل اللہ اور خدا کا دوست بن جائے گا اور نبی کا بیٹا اس پر چلنا چھوڑ دے تو وہ کفّار و مشرکین میں شمار ہوگا، اور طوفانِ نوحؑ میں غرق ہونے والوں کے ساتھ ڈبو دیا جائے گا۔ اور پھر حیرت یہ ہے کہ ان نسلی مسلمانوں سے تعصّب کی بنا پر بھی دیکھا جائے تو آپ کا یہ طرزِ عمل صحیح نہیں کیونکہ یہ "مسلمان قوم" تو جن کے چند نفوس انفرادی طور پر ابھی کچھ ظاہری مراسم ادا کرتے نظر آرہے ہیں یا جلسے جلوسوں میں اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں، برسوں سے اپنی اجتماعی اور عملی زندگی میں اسلام ترک کرکے دوسرے طریقے اختیار کرچکی، سیاست و اقتصادیات میں نیشنلزم اور سوشلزم، معاشیات میں سرمایہ پرستی اور مادّہ پرستی، خاندانی اور معاشرتی زندگی میں غیر اسلامی طور طریقے اور کچھ رسم و رواج، آخر اسلام ان میں رہ ہی کتنا گیا ہے؟ ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ جمعہ و عیدین اور نماز پنجگانہ جہاں جس حد تک بھی باقی ہے وہاں اس کی ظاہری شکل و صورت وہی ہے جو کتاب و سنّت نے مقرّر کی، مگر اس طرح تو آپ کو بہت سی چیزیں ایسی ملیں گی جو آپ کے اور آپ کے جانی دشمنوں میں بھی مشترک ہوں گی۔ اگر آپ لوگوں نے اس نہج پر سوچنے پر اصرار کیا تو پھر آپ لوگوں کے لیے اس زمین پر سانس لینا بھی مشکل ہو جائے گا۔

پھر جب پانی تک اسی اللہ کا پیتے ہو، رزق اسی کا کھاتے ہو، زراعت انسی کے قوانین کے مطابق کرتے ہو، ریل اور ریڈیو اسی کے

قوانین کے مطابق بناتے ہو، صحت و تندرستی اور بقاء نسل کے لیے اسی کے قوانین کا اتباع کرتے ہو، اسی کے قوانین قدرت کے مطابق دیکھتے ہو، سانس لیتے ہو، سُنتے ہو، پیدا ہوتے ہو اور مَر جاتے ہو، تو آخر اپنی روزانہ زندگی کے معاملات، باہمی تعلقات اور اجتماعی زندگی میں اس کی رہنمائی قبول کرنے سے کیوں جی چُراتے ہو؟ پھر جب طبعی اور تکوینی دنیا میں اسی کے قوانین اور منشاء پر چلنے سے عافیت، کامیابی اور ترقی حاصل ہوتی ہے تو زندگی کے اخلاقی اور اختیاری معاملات میں بھی خودسری اور دوسروں کی غلامی اور نقالی چھوڑ کر اس کی مرضی پر چل کر ذرا دیکھ تو لو۔

خدا کے لیے سب تعصّبات اور عصبیّتوں کو بالائے طاق رکھ کر کھلے دل سے مطالعہ کیجیے، وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے اور زندگی گھڑی کی چابی کی طرح سے اُدھڑتی چلی جارہی ہے۔ کیا عجب ہے کہ اللہ کے دین کا پرچم اُٹھانے کا کام اب اسی ملک کے بسنے والوں سے لیا جائے اور اس پُوری انسانیّت تک جو اِن انسان نما درندوں کے ہاتھوں جاں بلب ہو رہی ہے اب انہی کے ہاتھوں یہ آبِ حیات پہنچایا جانا مقدر ہو چکا ہو۔ دعوتِ حق کا اس منزہ شکل میں اس دیار سے اُٹھنا اور حضورؐ کا پونے چودہ سو برس پہلے یہ مژدہ سُنانا کہ مشرق سے مجھے ٹھنڈی ہوا آرہی ہے، کیا عجب کہ رنگ لے آئے اور یہ سعادت اللہ اسی دَور کے لوگوں کو عطا فرمادے۔

انسانی تاریخ کے اس نازک ترین مرحلے پر اب مسلمانوں کو بھی متنبہ

ہوجانا چاہیے کہ یا تو وہ اپنی ذمہ داری کو سمجھ کر شاہراہِ اسلام پر سیدھی طرح چلیں اور انبیاء علیہم السّلام کے صحیح جانشین بن کر اس خدائی مشن کو سرانجام دینے کے لیے تیار ہوجائیں یا پھر اپنے اعمال و اخلاق سے اسلام کے لیے بدنامی کا موجب نہ بنیں کہ دنیا ان کے اخلاق اور طرزِ عمل کو اسلامی اخلاق اور اسلامی طرزِ عمل قرار دے رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ غضبِ الٰہی بھڑک اُٹھے، اور ان کو بھی یہود کے ساتھ مِلا دیا جائے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝

MOASSESAH AL IMAM KHOMEINI TRUST (REGD)
کتابخانه امام خمینی

MOASSESAH AL IMAM KHOMEINI TRUST (REGD.)
کتابخانہ امام خمینی

دعوتِ اسلامی

اور

اس میں خواتین کا حصّہ

مولانا امین احسن اصلاحی

"ہم صرف ایک ہاتھ سے دینِ حق کی عمارت قائم نہیں کر سکتے۔ اس میں دوسرے ہاتھ یعنی عورت کا تعاون ضروری ہے۔ ہماری نسلوں کی پہلی تربیت گاہ ماں کی آغوش ہے۔ ماں کی چھاتی کے ایک ایک قطرۂ شیر کے ساتھ بچہ جذبات و حسیّات اور اخلاق بھی اپنے اندر جذب کرتا ہے اور اس کی ایک ایک ادا سے عمل کے طریقے سیکھتا ہے۔ ماں اگر مومنہ و مسلمہ ہے تو بچے بھی مومن و مسلم ہوں گے، ماں اگر روحِ ایمان و اسلام سے خالی ہے تو بچے بھی روح و ایمان و اسلام سے محروم ہوں گے۔ ہم اپنی نسلوں کی تمام اثرات سے حفاظت کر بھی لیں تو بھی یہ بالکل ناممکن ہے کہ ماؤں کے نیک و بد اثرات سے بچا سکیں۔"

"خیال تو کیجیے کبھی گنتی کے چند نفوس تھے لیکن زمین ان کے وجود سے تھرّا اٹھی تھی۔ لیکن آج مردم شماری کے اعتبار سے مسلمانوں کی تعداد کس قدر زیادہ ہے مگر صفحۂ گیتی کو خبر تک نہیں کہ کوئی اس کی پشت پر ہے۔ ہمیں خود بتانے کی ضرورت پڑتی ہے کہ ہم موجود ہیں۔ اگر عورتیں حضرت اسماءؓ کے نمونے پر چلیں گی تب ہی ان فرزندانِ اسلام کو پیدا کر سکیں گی جن کی موجودگی زمین کو محسوس ہو گی اور وہ پکار کر کہے گی کہ اس کے سینہ پر کوئی اللہ کے راستے کا سوار ہے اور اگر انہوں نے یہ روش اختیار نہ کی تو وہ یونہی پیدا ہوتی اور مرتی رہیں گی مگر وہ لوگ نہ پیدا ہوں گے جن سے اسلام کا بول بالا ہو۔"

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ
عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ، مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ

محترم خواتین وحضرات! مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ اس شہر میں آکر مجھے ماؤں اور بہنوں سے بھی کچھ کہنے کا موقع مل رہا ہے۔ ہمارے اس وقت میں غلط تعلیم وتربیت اور غلط روایات کے پھیلنے کی وجہ سے یہ حالت ہوگئی ہے کہ عورتیں جس طرح اپنی روٹی کپڑے کی ذمہ داری مردوں پر سمجھتی ہیں، اسی طرح دین کی ساری ذمہ داریاں بھی مردوں ہی پر خیال کرتی ہیں حالانکہ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء کرام جو دین لے کر آئے ہیں اس دین کی مخاطب عورتیں بھی اسی طرح ہیں جس طرح مرد ہیں۔ فرائض کے حدود ضرور مختلف ہیں لیکن دین کو اختیار کرنے، دین کو قائم کرنے، حق کی راہ میں جدوجہد کرنے، عنداللہ جوابدہ اور مسئول ہونے میں دونوں یکساں ہیں اور ایسے یکساں کہ اگر کوئی عورت ان حقوق وفرائض میں جو اللہ کی طرف سے اس پر عائد ہوتے ہیں، کوتاہی کرے گی، تو خدا کے ہاں اس سے اسی طرح پرسش ہوگی جس طرح مرد سے اس کی کوتاہیوں پر ہوگی۔ وہ مسئولیت سے ہرگز نہیں بچ سکتی۔ اگر آپ اپنی تاریخ کو پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کس طرح اقامتِ دین

کی جدوجہد میں عورتوں نے مردوں کے برابر حصّہ لیا ہے۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دینِ حق کی دعوت دی تو سب سے پہلے جن لوگوں نے اس دعوت کو قبول کیا ان میں ایک خاتون حضرت خدیجۃ الکبریٰ بھی ہیں۔ حالانکہ اس وقت اسلام کو قبول کرنا کوئی سہل کام نہ تھا۔ بلکہ دنیا جہان کی مصیبتوں کو مول لینا تھا۔ انہوں نے نہ صرف اسلام کو قبول کرنے میں سبقت کی بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈھارس بندھانے والی غیبی تائید اور حق کی امداد کا یقین دلانے والی توکّل اور بھروسہ کی تلقین کرنے والی بنیں۔ انہوں نے سب سے پہلے تسلّی دی، سب سے پہلے دینِ حق کے اس عَلم کو اٹھایا اور ایسی وفاداری اور عشق و شوق کے ساتھ کہ ان کی وفاداری نہ صرف عورتوں بلکہ مَردوں اور تمام نسلِ انسان کے لیے قابلِ فخر ہے۔

ان کا مال اور ان کا دل و دماغ سب اسلام پر نثار ہُوا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی وفات کا سب سے زیادہ غم ہُوا۔ اس لیے نہیں کہ آپ کی عزیز بیوی آپ سے جُدا ہو گئیں بلکہ اس لیے کہ دین کا سب سے بڑا جان نثار دنیا سے اُٹھ گیا۔

اہلِ حق پر سخت سے سخت دَور آئے، کون سی مصیبتیں ہیں جو ان پر نہیں توڑی گئیں، کانٹوں میں گھسیٹے گئے، تپتی ہوئی ریت پر لِٹائے گئے، گرم سلاخوں سے داغے گئے، بُری طرح زدوکوب کیے گئے۔ ان مصیبتوں کو مردوں کی طرح عورتوں نے بھی سہا۔ بلکہ تکلیفیں

جھیلنے اور شدائد و مصائب کو برداشت کرنے کی ان سے بہتر مثالیں مرد بھی پیش نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ وہ حق پرست خواتین تھیں جنہیں کسی تدبیر سے بھی رام نہ کیا جا سکا۔ پھر جب وہ وقت آیا کہ مکّہ کی فضا اہلِ حق کے لیے بالکل ہی ناسازگار ہو گئی، قریش نے مسلمانوں پر خدا کی زمین تنگ کر دی اور مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تو اس میں بھی خواتین شریک تھیں۔ اس کے بعد ہجرتِ مدینہ کا مرحلہ پیش آیا تو جس طرح مردوں نے اپنے وطن اور اپنے اعزاء اور اپنے املاک و اموال کو خیرباد کہا اسی طرح عورتوں نے بھی سارے علائق کو ترک کر کے حق کا ساتھ دیا۔ اور تاریخ اسلام کے بعد کے صبر آزما مرحلوں میں بھی عورتوں کی قربانی، ان کے استقلال و برداشت، ان کے اسلام سے تعلّق کی ایسی شاندار مثالیں ملتی ہیں کہ اگر ان کو بیان کیا جائے تو داستان بہت طویل ہو جائیگی۔ میرے کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ جب تک عورتیں اپنے درجہ کو ٹھیک ٹھیک سمجھتی تھیں اور جب تک یہ یقین دلوں میں جاگزین تھا کہ اسلام کی دعوت کے مخاطب مرد و عورت دونوں ہی ہیں۔ اور اقامتِ دین کی ذمّہ داری میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ عورتیں راہِ حق کے جانباز سپاہیوں میں تھیں، اس راہ کی پتھر نہیں بنی تھیں۔ عرب کی معاشرت میں یوں بھی عورت کی منزلت بہت پست تھی۔ اس لیے مخالفین کو ان پر مظالم توڑنے کی اور بھی زیادہ سہولتیں حاصل تھیں۔ عورتوں نے ان تمام تلخیوں کو گوارا کیا۔ اور عشقِ حق اور محبّتِ رسولؐ کی ایسی روایتیں قائم

کہیں کہ ان کوشش کرآج بھی دلوں میں گرمی اور ایمان میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ احد کے معرکہ میں نبی اکرمؐ اور آپ کے بہت سے رفقاء و اصحاب کو سخت حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ اس معرکے میں بعض دوسری ناگوار افواہوں کے ساتھ یہ خبر بھی پھیل گئی کہ حضورؐ شہید ہو گئے۔ اس خبر کا مدینہ پہنچنا تھا کہ ایک انصاریہ خاتون گھر سے نکل پڑیں کہ جو وجود پاک دینِ حق جاننے کا واحد ذریعہ تھا کیا واقعی وہ بھی دستِ ستم کا نشانہ بن گیا؟ وہ مدینہ سے نکل کر سیدھے میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ اُحد سے واپس آنے والا جو شخص ملتا اس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حال دریافت کرتیں۔ بعض آدمیوں نے ان سے کہا کہ نہایت غم و افسوس کے ساتھ یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ تمہارا نوجوان بیٹا، تمہارے والد اور تمہارے شوہر جنگ میں شہید ہو گئے۔ یہ خبر کس قدر صبر آزما تھی! ایک عورت کا کلیجہ پھاڑ دینے کے لیے ان میں سے کوئی ایک خبر بھی کافی تھی، ان کے عزیز ترین سہارے ایک ایک کر کے اس طرح رخصت ہو گئے تھے لیکن ان کا اسلام سے جو تعلق تھا اس کا ذرا اثر دیکھیے! فرماتی ہیں ــ "میں باپ، بیٹے اور شوہر کا ماجرا نہیں پوچھ رہی ہوں، یہ بتاؤ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ انہوں نے بشارت دی کہ الحمد للہ آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ بولیں کہ میں اس کو اس وقت تک باور نہیں کر سکتی جب تک روئے مبارک کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں۔ اس کے بعد حضورؐ کو صحیح و سالم دیکھ کر فرمایا: کُلُّ مُصِیْبَۃٍ بَعْدَکَ جَلِیْلٌ ط اے رسولِ پاکؐ آپکے

ہوتے ہوئے ساری مصیبتیں ہیچ ہیں۔

یہ ایک واقعہ ہے جو بطور مثال کے مَیں نے پیش کیا ہے۔ عورتوں کی تاریخ بہت روشن ہے اور اسلام کا ہر دَور ایسے بہت سے کارناموں سے معمور ہے۔ تاریخ اسلامی کے اس دَور میں بھی جب کہ مردوں کی ایمانی قوّت کمزور ہو گئی تھی ایسی عورتیں مِل جائیں گی جن پر مسلمان فخر کر سکتے ہیں۔

اسلام نے اپنے روشن زمانے میں جس قدر جنگیں لڑیں۔ ان میں مردوں نے اگر تیر و خنجر چلائے اور زخم پر زخم کھائے، تو عورتوں نے پانچے چڑھا کر زخمیوں کو پانی پلایا، ان کی مرہم پٹی کی، ان کی ڈھارس بندھائی، اپنے مال سے اپنے زیورات سے دینِ حق کی امداد کی۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں نے جبکہ آپؐ کے نام لینے والے کم تھے آپؐ کا خیر مقدم کیا۔ آپؐ کی تعریف کے گیت گائے اور آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا کہ "اے بچیو! کیا تم مجھ سے محبّت کرتی ہو؟" انہوں نے جواب دیا، ہاں! ارشاد ہوا "مَیں بھی تم سے محبّت کرتا ہوں"۔ مردوں میں سے کس گروہ کو یہ شرف حاصل ہو سکا۔

یہ اس دَور کا حال تھا جب عورتیں جانتی تھیں کہ مرد عورت دونوں دینِ حنیف کے یکساں حامل اور یکساں مخاطب ہیں۔ اس وقت تک ہر وہ چیز جو راہِ حق میں عائق بنی خواہ وہ کتنی ہی عزیز و محبوب کیوں نہ ہو اس کو انہوں نے ٹھکرا دیا۔ محبوب سے محبوب شوہر جس کا رشتہ دینِ حق سے استوار نہ

ہوتا، ان کی نگاہ میں مبغوض ہو جاتا۔ غریب سے غریب اور مفلس سے مفلس شوہر کو محض حق پرستی کی بنا پر انہوں نے محبوب بنایا۔ عورتوں نے اس چیز میں کبھی پست ہمتی نہیں دکھائی۔ شوہر نے اگر دینِ حق سے اعراض کیا تو عورت نے اس سے دامن چھڑا لیا۔ بیٹیوں تک کے رشتے انہوں نے دین کی خاطر توڑ ڈالے۔

اسلام کا اثر ان کے قلوب پر اس حد تک تھا کہ ان کی ساری نفرت و محبّت للہ و فی اللہ تھی۔ ماؤں کے لیے ان کے بیٹوں کا دولت مند ہونا قابلِ ذکر چیز نہ تھی۔ اگر وہ خدا کی فرمانبرداری کے جذبے سے سرشار نہ ہوں، کسی شوہر کا بڑے سے بڑا ایثار ان کی نظر میں کوئی وقعت نہ رکھتا تھا۔ اگر وہ مومن نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں ہے۔ یہ اس روشن دور کی روداد ہے جبکہ عورتوں کو یہ احساس تھا کہ وہ بھی دینِ حق کے قائم کرنے کی ذمّہ دار ہیں۔

اب دیکھیے کیسی کایا پلٹ گئی ہے۔ آج سمجھ لیا گیا ہے کہ جس طرح نان و نفقہ کی ذمّہ داری مرد پر ہے اسی طرح دین کے لیے جدوجہد کرنا بھی مرد ہی کا فریضہ ہے، ان کی پہلی غلطی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو شریعتِ الٰہی کا مخاطب نہیں سمجھتیں۔ حالانکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت مردوں اور عورتوں کو یکساں دی ہے۔ اس غلط تصوّر نے ہماری اسلامی زندگی تہس نہس کر ڈالی ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ عورتیں درحقیقت سوسائٹی کے تمام معائب و خرافات اپنے اندر اور اپنے بال بچّوں اور شوہروں کے اندر پھیلانے

کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ اور اگر انہیں ناگوار نہ ہو تو ذرا صاف الفاظ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ طاغوتی دَور میں عورتوں نے شیطان کی ایجنسی لے رکھی ہے۔ تمام وہ وبائیں جو سوسائٹی میں پھیلتی ہیں انہیں بُری طرح متاثر کرتی ہیں اور ان سے ان کی نسلوں اور ان کی اولادوں میں پھیلتی ہیں۔ دیہاتو میں حالات کچھ مختلف ہیں، مگر شہروں کے حالات بالعموم یہی ہیں۔

عورت کے بگڑنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام نسل کی ذہنی و اخلاقی حالت مسموم ہو جاتی ہے۔ کوئی ماں اپنے بچہ کے منہ میں صرف دودھ ہی نہیں ڈالتی بلکہ اس کے ساتھ اپنے اخلاق کی روح بھی اس کی رگ رگ کے اندر اُتارتی ہے۔ اگر اس کے اندر روحِ دین کمزور ہے، اخلاقِ انسانی اور حسِ ایمانی مُردہ ہے تو اس سے زیادہ زہریلے جراثیم بچے میں سرایت کر جائیں گے جتنے ایک مدقوق ماں کا دودھ پینے سے ایک بچّہ کے اندر پہنچ جاتے ہیں۔

صحیح اسلامی تربیّت کا اصلی سرچشمہ اور بہترین ذریعہ ہماری مائیں ہیں۔ جب تک ہماری مائیں حضرت اسماءؓ کے نمونہ کی تقلید نہ کریں گی کس طرح عبداللہ بن زبیر جیسے جانباز پیدا ہو سکیں گے؟ جبتک وہ راہِ حق میں سولی پر چڑھ جانے والے بیٹے کو دیکھ کر یہ نہ کہیں کہ اچھا ابھی مرکب سے یہ سوار اُترا نہیں۔ اس وقت تک دار و رسن کا کھیل کھیلنے والے فرزند کن کی کوکھوں سے جنم لیں گے؟ انہی محترم خاتون سے جبکہ یہ اپنی بینائی کھو چکی ہیں، بیٹے نے آکر آزمائش کے طور پر ماں سے پوچھا۔ "ماں

مَیں اپنے آپ کو اعداء کے حوالے کر دُوں یا معافی مانگ لُوں۔" انہوں نے اپنے کمزور ہاتھوں سے آپ کو پکڑا، اور بدن کو چھُو کر پوچھا کہ "یہ کیا پہن رکھا ہے؟" انہوں نے عرض کیا "زرہ"۔ فرمایا "راہ حق کے مجاہدوں کو اس قسم کے پردوں کی ضرورت نہیں، اسے اُتار دو اور راہِ حق میں سینہ سپر ہو کر لڑو کہ کل کو تمہارے دشمنوں کو تم پر ہنسنے کا کوئی موقع نہ ملے۔"

ہم صرف ایک ہاتھ سے دینِ حق کی عمارت قائم نہیں کر سکتے۔ اس میں دوسرے ہاتھ یعنی عورت کا تعاون ضروری ہے۔ ہماری نسلوں کی پہلی تربیت گاہ ماں کی آغوش ہے۔ ماں کی چھاتی کے ایک ایک قطرۂ شیر کے ساتھ بچہ جذبات و حسیات اور اخلاق بھی اپنے اندر جذب کرتا ہے اور اس کی ایک ایک ادا سے عمل کے طریقے سیکھتا ہے۔ ماں اگر مومنہ و مسلمہ ہے تو بچے بھی مومن و مسلم ہونگے ہاں اگر روح ایمان و اسلام سے خالی ہے تو بچے بھی اسی طرح ایمان و اسلام سے محروم ہوں گے۔ ہم اپنی نسلوں کی تمام اثرات سے حفاظت کر بھی لیں تو یہ بالکل ناممکن ہے کہ ماؤں کے نیک و بد اثرات سے ان کو بچا سکیں۔

مردوں کی خرابی کے اثرات بھی مہلک ہیں مگر ان کی خرابی سے ممکن ہے کہ بچنے کی شکلیں پیدا ہو جائیں۔ لیکن عورتوں کے بگاڑ کے خراب نتائج سے بچنا ناممکن ہے۔ ان کی پیدا کی ہوئی خرابی جڑ کی خرابی ہے، شاخوں اور تنے کی خرابی نہیں ہے، اس کا علاج ناممکن ہے۔ اسی وجہ سے

ان پر ذمّہ داری بہت سخت ہے۔ یہ جو بیماریاں بچّوں کو پلا دیں گی کوئی ماہر سے ماہر طبیب بھی ان کا علاج نہیں کر سکتا۔ جو درخت اپنی نشوونما کے ابتدائی دَور ہی میں آفت رسیدہ ہو جائے پھر اس کا تن آور ہونا مشکل ہی ہوتا ہے۔ پس عورتوں کا فرض ہے کہ آج ہم دین کو تازہ کرنے کا جو عزم لے کر اُٹھے ہیں اس کام میں ہمارا ہاتھ بٹائیں ہم ان کی شرکتِ عمل کے سخت محتاج ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم عورتوں کو اب تک براہِ راست مخاطب کرنے کے وسائل پیدا نہ کر سکے۔ مَیں ماؤں اور بہنوں سے خدا کا واسطہ دے کر عرض کرتا ہوں کہ وہ اپنی غفلت دُور کریں، اپنی ذمّہ داریوں کو محسوس کریں۔ یہ چیز ان کے فرائض میں سے ہے کہ وہ سمجھیں کہ اللہ کا دین کیا ہے، خدا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا ہے؟ ہر ماں، ہر لڑکی اور ہر بہن کا یہ فریضہ ہے۔ پھر ان کے فرائض میں یہ بھی ہے کہ ان کے بطن سے جو بچے پیدا ہوں، ان کے اندر صرف دودھ ہی نہ اُتاریں بلکہ اپنے عمل سے اپنے اخلاق سے اور روز کی زندگی سے ان میں ان تمام اساساتِ دین کو راسخ کر دیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا لبِ لباب ہیں، انہیں اپنی جدوجہد کے نتائج کی طرف سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ان کا مرتبہ بہت اونچا ہے۔ ان کی باتیں بے اثر نہیں رہ سکتی ہیں، اپنے بچّوں کو باقاعدہ حکم دے سکتی ہیں اور ہر سعید بیٹے کا فرض ہے کہ وہ اپنی ماں کے حکم کی تعمیل کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا

کہ کس کی خدمت کروں؟ آپؐ نے فرمایا، ماں کی۔ پھر یہی سوال کیا، فرمایا ماں کی، پھر یہی پوچھا، جواب دیا، ماں کی۔ چوتھی دفعہ پوچھنے پر فرمایا، باپ کی۔ لیکن شوہر کے ساتھ بیوی کا تعلق تعاون کا تعلق ہے۔ اور یہ تعاون دین و دنیا دونوں میں ہے۔ جس طرح گھریلو زندگی میں ایک بیوی کا فرض ہے کہ وہ شوہر کی وفادار، امانت دار اور خیر خواہ رہے، اسی طرح دینی معاملات میں بھی اس کا فرض ہے کہ وہ شوہر کو نیکی اور بھلائی کے مشورے دے اور اس کی گمراہیوں پر اس سے زیادہ بیچین ہو، جتنا دنیوی معاملات میں اس کی غلطیوں پر ہوتی ہے اور اس کام میں اسے جو دُکھ بھی اٹھانے پڑیں انہیں صبر کے ساتھ برداشت کرے، لیکن کبھی ٹھنڈے دل سے شوہر کی گمراہیوں کو گوارا نہ کرے۔ اگر کوئی شوہر نیک ارادہ کرے تو ہرگز ہرگز کوئی عورت محض رسم و رواج کی پابندی کی وجہ سے اس کے ارادۂ حق میں رکاوٹ نہ ڈالے۔ وہ یہ ضرور معلوم کرے کہ دینِ حق کی تعلیم کیا ہے؟ اور جب معلوم ہو جائے کہ شوہر صحیح راستہ پر گامزن ہے تو اس سے تعاون کرے، اس کی ڈھارس بندھائے، اس کی حوصلہ افزائی کرے۔ عُسر و یسر ہر حال میں اس کی رفاقت و غمگساری کا یقین دلائے۔ حقیقت یہ ہے کہ بغیر اس کی رفاقت کے مرد کے لیے راہِ حق کا سفر بہت دشوار ہے۔ یہی ایک کوچہ ہے جس میں میاں بیوی کی رفاقت سب سے زیادہ مطلوب اور اللہ کو پسند ہے۔ جو عورت دینِ حق کی اقامت

کی راہ میں مرد کا دست و بازو بنتی ہے ۔ اس مقصد کی خاطر مصیبتیں جھیلتی ہے ۔ اور فاقے کرتی ہے ۔ وہی عورت امہات المومنینؓ اور صحابیاتؓ کے مبارک نمونے پر ہے ۔ اور جو عورت اس راہ میں پتھر بنتی ہے تو وہ عورت وہ ہے جس نے شیطان کی ایجنسی لے رکھی ہے ۔

ہماری اصلی دولت عورتوں ہی کے پاس ہے ۔ نسلیں انہی کی تحویل میں ہیں ۔ اُن کا بٹھایا ہوا نقش قبر تک کھُرچنے کے باوجود نہیں مِٹتا ، خواہ وہ نقشِ باطل بٹھائیں یا نقشِ حق ۔ وہ چاہیں تو ان کے فیضِ تربیّت سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو ہماری تاریخ کو از سرِ نَو روشن کر دیں اور چاہیں تو اسی طرح کے لوگوں کو جنم دیں جیسے کہ آج کل کے مسلمان ہیں ۔ خیال تو کیجیے کبھی گنتی کے چند نفوس تھے ، لیکن زمین ان کے وجود سے تھرّا اُٹھی تھی ۔ لیکن آج مردم شماری کے اعتبار سے مسلمانوں کی تعداد کس قدر زیادہ ہے ، مگر صفحۂ گیتی کو خبر تک نہیں کہ کوئی اس کی پُشت پر ہے ۔ ہمیں خود بتانے کی ضرورت پڑتی ہے کہ ہم موجود ہیں ۔ اگر عورتیں حضرت اسماءؓ کے نمونہ پر چلیں گی تب ہی ان فرزندانِ اسلام کو پیدا کر سکیں گی جن کی موجودگی زمین کو محسوس ہوگی ، اور وہ پُکار کر کہے گی کہ اس کے سینے پر کوئی اللہ کے راستے کا سوار ہے ۔ اگر انہوں نے یہ روش اختیار نہ کی تو دنیا یُونہی پیدا ہوتی اور مَرتی رہے گی ۔ مگر وہ لوگ پیدا نہ ہونگے جن سے اسلام کا بول بالا ہو ۔

مَیں پھر اپنی ماؤں اور بہنوں سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنی

روشن تاریخ کو یاد کریں اور اس راہ پر چلنے کی کوشش کریں۔ ہم نے اپنے خدا سے جو مبارک عہد کیا ہے کہ ہم دینِ حق کو اپنے اوپر اور دُوسروں پر قائم کریں گے اس میں وہ ہماری مدد کریں۔

مَیں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ مردوں کو توفیقِ عمل دے۔ اور عورتوں کو اس راہ میں ان کا رفیقِ سفر بنا دے۔ آمین۔

عورت اسلامی معاشرہ میں

(مولانا سید جلال الدین انصر عمری)

- اسلام کے نظام معاشرہ کی مکمل تصویر ـــــ
- اسلام اور دوسری تہذیبوں میں عورت کا مقام ـــــ
- اسلامی معاشرہ کی بنیادیں اور اس کی امتیازی خصوصیات ـــــ
- اسلام میں عورت کا صحیح مقام اور دائرۂ کار ـــــ
- اسلام اور دوسری تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ
- اپنے موضوع پر ایک بلند پایہ، تحقیقی اور نادر کتاب ـــــ
- معاشرہ کو صحیح اسلامی خطوط پر استوار کرنے کے لیے ایک ضروری کتاب ـــــ

عمدہ کتابت وطباعت ـــــ خوبصورت جلد ـــــ صفحات ۴۶۴

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ـــــ ۶ روپے
سستا ایڈیشن ـــــ ۴٫۷۵

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳ ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور